

تفسير القرآن

الأنفال

(٨)

الانفال

زمانہ نزول | یہ سورہ سلسلہ ہجری میں جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس میں اسلام کو کفر کی اس پہلی جنگ پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک سورہ کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے، غالباً یہ ایک ہی مقررہ ہے جو یک وقت نازل فرمائی گئی ہوگی، مگر ممکن ہے کہ اس کی بعض آیات جنگ بدر ہی سے پیدا شدہ مسائل کے تعلق بعد میں آئیں اور پھر ان کو سلسلہ تقریر میں مناسب جگہوں پر درج کر کے ایک مسلسل تقریر بنا دیا گیا ہو۔ بہر حال کلام میں کہیں کوئی ایسا جوڑ نظر نہیں آتا جس سے یہ گمان کیا جاسکے کہ یہ الگ الگ دو تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

تاریخی پس منظر | قبل اس کے کہ اس سورہ پر تبصرہ کیا جائے، جنگ بدر اور اس سے تعلق رکھنے والے حالات پر ایک تاریخی نگاہ ڈال لینی چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ابتدائی دس بارہ سال میں، جبکہ آپ مکہ معظمہ میں مقیم تھے، اس حیثیت سے اپنی بیچلی و استواری ثابت کر چکی تھی کہ ایک طرف اس کی پشت پر ایک بلند سیرت، عالی ظرف اور دانشمند علمبردار موجود تھا جو اپنی شخصیت کا پورا سرمایہ اس کام میں لگا چکا تھا اور اس کے طرز عمل سے یہ حقیقت پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ وہ اس دعوت کو انتہائی کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے نائل ارادہ رکھتا ہے اور اس مقصد کی راہ میں ہر خطرے کو اٹھانے اور ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسری طرف اس دعوت میں خود ایسی کشش تھی کہ وہ دلوں اور مانگوں میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی اور جہالت و جاہلیت اور تعصبات کے حصار اس کی راہ روکنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ اس وجہ سے عرب کے پرانے نظام جاہلی کی حمایت کرنے والے عناصر، جو ابتداءً اس کو استخفاف کی نظر سے دیکھتے تھے، اب اس کے آخری زمانہ میں اسے ایک سنجیدہ خطرہ سمجھنے لگے تھے اور اپنا پورا زور اسے کچل دینے میں صرف کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت تک چند حیثیات سے اس دعوت میں بہت کچھ کسری باقی تھی:

اولاً یہ بات ابھی پوری طرح ثابت نہیں ہوئی تھی کہ اس کو ایسے پیروں کی ایک کافی تعداد ہم پہنچ گئی ہے جو صرف اس کے انٹے والے ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے اصولوں کا سچا عشق بھی رکھتے ہیں، اس کو غالب و نافذ کرنے کی سعی میں اپنی ساری قوتیں اور اپنا تمام سرمایہ زندگی کھپا دینے کے لیے تیار ہیں، اور اس کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے لیے۔ دنیا بھر سے (جو جانے کے لیے، حتیٰ کہ اپنے عزیز ترین رشتوں کو بھی کاٹ پھینکنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اگرچہ کہ میں پیروان اسلام نے قریش کے ظلم و تمرد و رداشت کر کے

اپنی صداقت ایمانی اور اسلام کے ساتھ اپنے تعلق کی مضبوطی کا اچھا خاصا ثبوت دے دیا تھا مگر ابھی بیٹا ہونے کے لیے بہت سی آزمائشیں باقی تھیں کہ دعوت اسلامی کو جانفروشی پیروں کا وہ گروہ میسر آ گیا ہے جو اپنے نصیب العین کے مقابلہ میں کسی چیز کو بھی عزیز تر نہیں رکھتا۔

ثانیاً، اس دعوت کی آواز اگرچہ سارے ملک میں پھیل گئی تھی، لیکن اس کے اثرات منتشر تھے، اس کی فراہم کردہ قوت سارے ملک میں پرانگندہ تھی، اس کو وہ اجتماعی طاقت ہم نہ پہنچی تھی جو پرانے سہے ہوئے نظام جاہلیت سے فیصلہ کن تقابل کرنے کے لیے ضروری تھی۔

ثالثاً، اس دعوت نے زمین میں کسی جگہ بھی جڑ نہیں پکڑی تھی بلکہ ابھی تک وہ صرف ہوا میں صراہب کر رہی تھی۔ ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ قدم جما کر اپنے موقف کو مضبوط کر تی اور پھر آگے بڑھنے کی سعی کرتی۔ اس وقت تک جو مسلمان جہاں بھی تھا اس کی حیثیت نظام کفر و شرک میں بالکل ایسی تھی جیسے خالی معدے میں گہنیں، ہر معدہ ہر وقت اسے اگل دینے کے لیے زور لگا رہا ہو اور قرار پانے سے لیے اس کو جگہ ہی نہ ملتی ہو۔

رابعاً، اس وقت تک اس دعوت کو عملی زندگی کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے کر چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ اپنا تمدن قائم کر سکی تھی۔ نہ اس نے اپنا نظام معیشت و معاشرت اور نظام سیاست مرتب کیا تھا اور نہ دوسری طاقتوں سے اس کے معاملات صلح و جنگ پیش آئے تھے۔ اس لیے نہ تو ان اخلاقی اصولوں کا مظاہرہ ہو سکا تھا جو پر یہ دعوت زندگی کے پورے نظام کو قائم کرنا اور جانا چاہتی تھی، اور نہ ہی بات آزمائش کی کسوٹی پر لایا جی طرح نمایاں ہوئی تھی کہ اس دعوت کا پیغمبر اور اس کے پیروں کا گروہ جس چیز کی طرف دنیا کو دعوت دے رہا ہے اس پر عمل کرنے میں وہ خود کس حد تک راستیا رہے۔

بعد کے واقعات نے وہ مواقع پیدا کر دیے جن سے یہ چاروں کیوں پوری ہو گئیں۔

پہلی دور کے آخری تین چار سالوں سے یثرب میں آفتاب اسلام کی شعاعیں مسلسل پہنچ رہی تھیں اور وہاں کے لوگ متعدد وجوہ سے عرب کے دوسرے قبیلوں کی یہ نسبت نہ زیادہ آسانی کے ساتھ اس روشنی کو قبول کرتے جا رہے تھے۔ آخر کار بتوت کے بارہویں سال حج کے موقع پر ۵ نفوس کا ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی تاریکی میں ملا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا بلکہ آپ کو اور آپ کے پیروں کو اپنے شہر میں جگہ دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ یہ اسلام کی تاریخ میں ایک انقلابی موقع تھا جسے خدا نے اپنی عنایت سے فراہم کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھا کر کپے لیا۔ اہل یثرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے نائب اور اپنے امام و فرمانروا کی حیثیت سے ملا رہے تھے۔ اور اسلام کے پیروں کو ان کا ملاوا اس لیے نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں محض ہمارے ہونے کی حیثیت سے جگہ پالیں، بلکہ مقصد یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور گروہوں میں جو

مسلمان منتشر ہیں وہ یثرب میں جمع ہو کر اور شہری مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک منظم معاشرہ بنا لیں۔ اس طرح یثرب نے دراصل اپنے آپ کو ”مدینۃ الاسلام“ کی حیثیت سے پیش کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول کر کے عرب میں پہلا دارالاسلام بنا لیا۔

اس پیش کش کے معنی جو کچھ تھے اس سے اہل مدینہ ناواقف نہ تھے۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ ایک چھوٹا سا قصبہ اپنے آپ کو پورے ملک کی تلواروں اور محاشی و تمدنی بائیکاٹ کے مقابل میں پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ بیعت عقبہ کے موقع پر رات کی اُس مجلس میں اسلام کے ان اولین مدوکاروں (انصار) نے اس نتیجہ کو خوب اچھی طرح جان بوجھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ عین اس وقت جبکہ بیعت ہو رہی تھی، یثربی وفد کے ایک نوجوان رکن اسعد بن زرارہ نے، جو پورے وفد میں سب سے کم سن شخص تھے، اٹھ کر کہا:۔

سر وید ایا اهل یثرب! انالہ نضرب الیہ اکیاد الابل الاولیٰ و نحن نعلم انه رسول اللہ وان اخراجہ الیوم منا و اذۃ للعرب کافلتہ، و قتل خیبارکم، و تعصکم السیوف۔ فاما انتم قوم تصبرون علی ذلک فخذوا و اجروہ علی اللہ، و اما انتم قوم تخافون من انفسکم خیفۃ فذروہ فینوا ذلک فهو اعدس لکم عند اللہ۔

”میرے اہل یثرب، ہم لوگ جو ان کے پاس آئے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج انھیں بیان سے نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تمہارے نو نماں قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسینگی۔ لہذا اگر تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اور اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر چھوڑ دو اور صاف صاف غدر کر دو کیونکہ اس وقت غدر کر دینا حملہ کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔“

اسی بات کو وفد کے ایک دوسرے شخص عباس بن عبدہ بن نضد نے دہرایا:

انعلمون علامہ تبايعون هذا الرجل، (قالوا نعم) قال انکم تبايعونہ علی حرب الاحمر والاسود من الناس۔ فان کنتم تترون انکم اذا نھکت اموالکم مصیبا و اشرافکم قتلا اسلمتموہ فمن الان فدعوہ، فهو واللہ ان فعلتم خزی الدنیا و الآخرۃ و ان کنتم تترون انکم تافون لہ بما مدعوتموہ الیہ علی نھکت الاموال و قتل الاشراف فخذوا، فهو واللہ خیر الدنیا و الآخرۃ۔

”جانتے ہو اس شخص سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ (آواز میں) ہاں جانتے ہیں تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا بھر سے دھائی مول لے رہے ہو۔ پس اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمہارے مال تباہی کے اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطر سے میں بڑ جائیں تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے کہ

آج ہی اسے چھوڑ دو کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے۔ اور اگر تمہارا ارادہ یہ ہے کہ جو بلاوا تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشرف کی ہلاکت کے باوجود نہا ہو گے تو بے شک اس کا ہاتھ نعام کو کہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے ۵

اس پر تمام وفد نے بالاتفاق کہا فَا تَا نَا خِذْ عَلٰیٰ هٰٓؤُلَاءِ مِثْلَ الَّذِیْنَ اَشْرَفُوْا۔

”ہم اسے لے کر اپنے اموال کو تباہی اور اپنے اشرف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں“ تب وہ مشہور بیعت واقع ہوئی جسے تاریخ میں بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔

دوسری طرف اہل مکہ کے لیے یہ معاملہ جو معنی رکھتا تھا وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ دراصل اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو، جن کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی قابلیتوں سے قریش کے لوگ واقف ہو چکے تھے ایک ٹھکانا میسر آ رہا تھا۔ اور ان کی قیادت و رہنمائی میں یہ وہاں اسلام، جن کی عزیمت و استقامت اور قدامت کو بھی قریش ایک حد تک آزما چکے تھے، ایک منظم تحفے کی صورت میں جمع ہوئے جاتے تھے۔ یہ پرانے نظام کے لیے موت کا پیغام تھا۔ نیز مدینہ جیسے مقام پر مسلمانوں کی اس طاقت کے جمع ہونے سے قریش کو مزید خطرہ یہ تھا کہ میں سے شام کی طرف جو تجارتی شاہراہ ساحل بحر کے کنارے کٹا رہے جاتی تھی، جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے مشرک قبائل کی معاشی زندگی کا انحصار تھا وہ مسلمانوں کی زد میں آ جاتی تھی اور اس شدہ رگ پر ہاتھ ڈال کر مسلمان نظام جاہلی کی زندگی دشوار کر سکتے تھے۔ صرف اہل مکہ کی وہ تجارت جو اس شاہراہ کے بل پر چل رہی تھی ڈھائی لاکھ اشرفی ملانہ تک پہنچتی تھی۔ مخالفت اور دوسرے مقامات کی تجارت اس کے ماسوا تھی۔

قریش ان نتائج کو خوب سمجھتے تھے۔ جس رات بیعت عقبہ واقع ہوئی اسی رات اس معاملہ کو چھٹک اہل مکہ کے کانوں میں بڑی اور بڑے ہی کھلبلی مچ گئی۔ پہلے تو انھوں نے اہل مدینہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹورنے کی کوشش کی پھر جب مسلمان ایک ایک دو دو کر کے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے لگے اور قریش کو یقین ہو گیا کہ اب محمد بھی وہاں منتقل ہو جائیں گے تو وہ اس خطرے کو روکنے کے لیے آخری چارہ کار اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہجرت نبوی سے چند ہی روز پہلے قریش کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس میں بڑی رد و کد کے بعد آخر کار بیٹے پاک کی بی بی ہاشم کے سوا تمام خاندان ہائے قریش کا ایک ایک آدمی چھاننا جائے اور یہ سب لوگ مل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کریں تاکہ نبی ہاشم کے لیے تمام خاندانوں سے تنہا و نامشکل ہو جائے اور وہ انتقام کے بجائے خونِ مائتوب کر کے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن خدا کے فضل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد علی اللہ اور حسن تدبیر سے ان کی یہ چال ناکام ہو گئی اور حضور بیعت مدینہ پہنچ گئے۔ اس طرح جب قریش کو ہجرت کے روکنے میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے مدینہ کے سردار عبداللہ بن ابی کو دجسے ہجرت سے پہلے اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانے کی تیاری کر چکے تھے اور جس کی تمناؤں پر حضور کے مدینہ

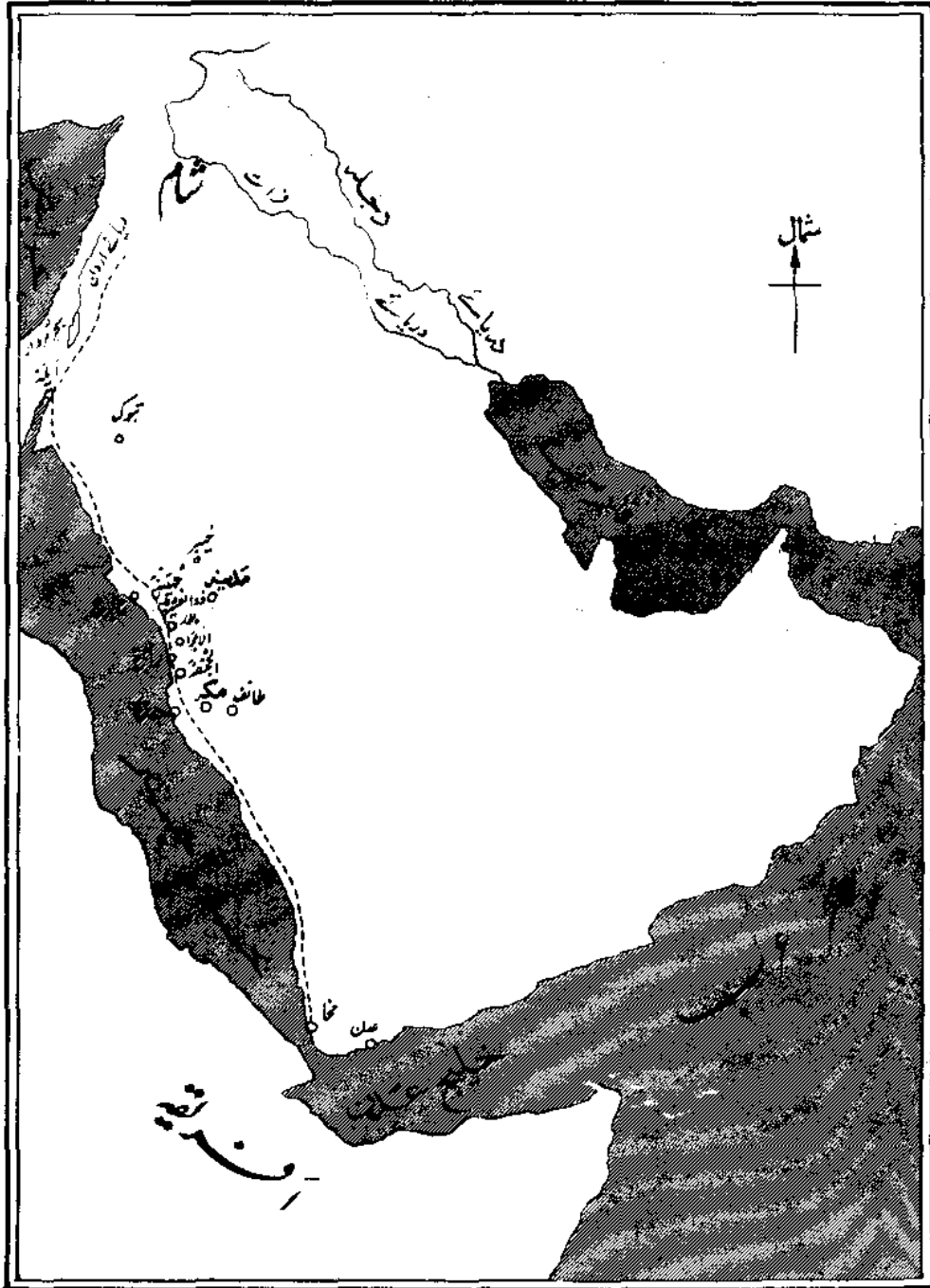
پہنچ جانے اور اُس وقت زنج کی اکثریت کے مسلمان ہو جانے سے پانی پھر چوکا تھا خط لکھا کہ تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم خود اس سے لڑو یا اسے نکال دو! ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہوں گے اور تمہارے مردوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔" عبداللہ بن ابی اس پر کچھ آمادہ نہ ہوا، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بروقت اس کے شرکی روک تھام کر دی پھر سعد بن محاذ رئیس مدینہ منورہ کے لیے مکہ گئے وہاں عین حرم کے دروازے پر ابو جہل نے ان کو ٹوک کر کہا: الا اراک تطوف بمکہ اہنا وقد ادریتہم الضباۃ ذرعتہم انکم تنصرونہم ونہم و تعینونہم ۹ لوکلا انک مع ابی صفوان ما رجعت الی اہلک سألنا ما تم تو ہمارے دین کے مندوں کو پناہ دو اور ان کی امداد و اعانت کا دم بھرو اور ہم تمہیں اطمینان سے مکہ میں طواف کرنے دیں؟ اگر تم اُمیہ بن خلف کے ہمان نہ ہوتے تو زندہ یہاں سے نہیں جاسکتے تھے، سعد نے جواب میں کہا: واللہ لش منعتنی ہذا الا منعناک ما ہوا اللہ علیک منہ، اطریقک علی المدینۃ (خدا اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں نہیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمہارے لیے اس سے شدید تر ہے، یعنی مدینہ پر سے تمہاری روکڑ۔ یہ گویا اہل مکہ کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ زیارت بیت اللہ کی راہ مسلمانوں پر بند ہے، اور اس کا جواب اہل مدینہ کی طرف سے یہ تھا کہ شامی تجارت کا راستہ مخالفین اسلام کے لیے پرخطر ہے۔

اور فی الواقع اُس وقت مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر بھی نہ تھی کہ اس تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کریں تاکہ قریش اور وہ دوسرے قبائل جن کا مفاد اس راستے سے وابستہ تھا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی معاندانہ و مزاحمانہ پالیسی پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ مدینہ پہنچتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نوخیز اسلامی سوسائٹی کے ابتدائی نظم و نسق اور اطراف مدینہ کی یہودی آبادیوں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر توجہ منعطف فرمائی وہ اسی شاہراہ کا مسئلہ تھا۔ اس مسئلے میں حضور نے دو اہم تدبیریں اختیار کیں۔

ایک یہ کہ مدینہ اور ساحل بحر احمر کے درمیان اس شاہراہ سے متصل جو قبائل آباد تھے ان کے ساتھ گفت و شنید شروع کی تاکہ وہ حلیفانہ اتحاد یا کم از کم ناظر فداری کے معاہدے کریں۔ چنانچہ جاس میں آپ کو یوڑی کامیابی ہوئی۔ سب سے پہلے جہینہ سے، جو ساحل کے قریب پہاڑی علاقے میں ایک اہم قبیلہ تھا، معاہدہ ناظر فداری طے ہوا۔ پھر سلسلہ ہجری کے آخر میں بنی خزیمہ سے جن کا علاقہ یمن اور ذوالعشیرہ سے متصل تھا دفاعی معاونت (Defensive alliance) کی قرارداد ہوئی۔ پھر سلسلہ ہجری کے وسط میں بنی نضیر بھی اس قرارداد میں شریک ہو گئے کیونکہ وہ بنی منقرہ کے ہمسائے اور حلیف تھے۔ مزید برآں تبلیغ اسلام نے ان قبائل میں اسلام کے حامیوں اور پیروں کا بھی ایک اچھا خاصا عنصر پیدا کر دیا۔

دوسری تدبیر آپ نے یہ اختیار کی کہ قریش کے قافلوں کو مکہ وینے کے لیے اس شاہراہ پر ہم چھوڑے

قریش کی تجارتی شاہراہ



چھوٹے دستے بھیجے شروع کیے اور بعض دستوں کے ساتھ آپ خود بھی تشریف لے گئے۔ پہلے سال اس طرح کے چار دستے گئے جو مغازی کی کتابوں میں شریہ حمزہ، سرینہ عبیدہ بن حارث، سرینہ سعد بن ابی وقاص اور غزوة الیویہ کے نام سے موسوم ہیں۔ اور دوسرے سال کے ابتدائی مہینوں میں دو مزید ناختمین اسی جانب کی گئیں جن کو اہل مغازی غزوة یو اطا اور غزوة ذوالنہیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان تمام مہموں کی دو خصوصیتیں قابل لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے کسی میں نہ تو کشت و خون ہوا اور نہ کوئی قافلہ لوٹا گیا جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان ناختموں کا اصل مقصد قریش کو ہوا کا رخ بتانا تھا۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے کسی ناختم میں بھی حضور نے اہل مدینہ کا کوئی آدمی نہیں لیا بلکہ تمام دستے خالص کی ماجرہ میں سے ہی مرتب فرماتے رہے تاکہ حتی الامکان یہ شکمش قریش کے اپنے ہی گھروالوں تک محدود رہے اور دوسرے قبیلوں کے اس میں اچھے سے آگ پھیل نہ جائے۔ ادھر سے اہل مکہ بھی مدینہ کی طرف غارت گردستے بھیجتے رہے چنانچہ انہی میں سے ایک دستے نے کوزہ بن جابر القہری کی قیادت میں عین مدینہ کے قریب ڈاکہ مارا اور اہل مدینہ کے مویشی لوٹ لیے۔ قریش کی کوشش اس سلسلہ میں یہ رہی کہ دوسرے قبیلوں کو بھی اس کشمکش میں اُلجھادیں، نیز یہ کہ انہوں نے بات کو محض دھمکی تک محدود نہ رکھا بلکہ لوٹ مار تک نوبت پہنچا دی۔

حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ شعبان ۳۲ھ ہجری (فروری یا مارچ ۶۲۳ء) میں قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ جس کے ساتھ تقریباً ۵۰ ہزار شرفی کا مال تھا اور تیس چالیس سے زیادہ محافظ تھے، شام سے مکہ کی طرف پہلے ہوئے اس علاقہ میں پہنچا جو مدینہ کی زد میں تھا۔ چونکہ مال زیادہ تھا اسی لحاظ سے اور سابق حالات کی بنا پر خطرہ تو ہی تھا کہ کہیں مسلمانوں کا کوئی طاقتور دستہ اس پر چھا پہ نہ مارے، اس لیے سردار قافلہ ابوسفیان نے اس پر خطر علاقہ میں پہنچتے ہی ایک آدمی کو مکہ کی طرف دوڑا دیا تاکہ وہاں سے مدد لے آئے اس شخص نے مکہ پہنچتے ہی عرب کے قدیم قاعدے کے مطابق اپنے اونٹ کے کان کاٹے، اس کی ناک چیر دی، کچا دے کواٹ کر رکھ دیا اور اپنا قبضہ آگے پیچھے سے پھاڑ کر شور مچا نا شروع کر دیا کہ :
یا معشر قریش! اللطیمة اللطیمة! اموالکم مع ابی سفیان قد عرض لہا محمد فی اصحابہ، لا ادری ان تذکوہا، الغوث، الغوث، الغوث! قریش والو! اپنے قافلہ تجارت کی خبر لو، تمہارے مال جو ابوسفیان کے ساتھ ہیں، محمد اپنے آدمی لے کر ان کے درپے ہو گیا ہے، مجھے امید نہیں کہ تم انہیں پاسکو گے، دوڑ دوڑو مدد کے لیے)۔ اس پر سارے مکہ میں ہرجان برپا ہو گیا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے سردار جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ تقریباً ایک ہزار مردان جنگی جن میں سے ۶۰۰ زرہ پوش تھے اور جن میں تلو سواروں کا رسالہ بھی شامل تھا، پوری شان و شوکت کے ساتھ یونے کے لیے چلے۔

سلسلہ اسلامی تاریخ کی اصطلاح میں شریہ اس مہم کو کہتے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کی قیادت میں بھیجا کرتے تھے اور غزوة اس

مہم کو کہتے تھے جس کی قیادت حضور خود فرماتے تھے۔

اُن کے پیش نظر صرف یہی کام نہ تھا کہ اپنے قافلے کو بچالائیں، بلکہ وہ اس ارادے سے نکلے تھے کہ اس آٹے دن کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں اور مدینہ میں یہ مخالفت طاقت جو ابھی نئی نئی متحج ہوتی شروع ہوئی ہے اسے کچل ڈالیں اور اس نواح کے قبائل کو اس حد تک مرعوب کر دیں کہ آئندہ کے لیے یہ تجارتی راستہ بالکل محفوظ ہو جائے۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے، محسوس فرمایا کہ فیصلہ کی گھڑی آپہنچی ہے اور یہ ٹھیک وہ وقت ہے جبکہ ایک جسور اندہ اقدام اگر نہ کر ڈالا گیا تو تحریک اسلامی ہمیشہ کے لیے بے جان ہو جائے گی، بلکہ بعینہ میں کہ اس تحریک کے لیے سر اٹھانے کا پھر کوئی موقع ہی باقی نہ رہے۔ نئے دارالہجرت میں آئے ابھی پورے دو سال بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مہاجرین بے سرو سامان، انصار ابھی نا آزمودہ، یہودی قبائل پر سر مخالفت، خود مدینہ میں منافقین و مشرکین کا ایک اچھا خاصا طاقتور عنصر موجود، اور گرد و پیش کے تمام قبائل قریش سے مرعوب بھی اور مذہباً ان کے ہمدرد بھی۔ ایسے حالات میں اگر قریش مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر بھجائے گا خاتمہ ہو جائے لیکن اگر وہ حملہ نہ کریں اور صرف اپنے زور سے قافلے کو بچا کر ہی نکال لے جائیں اور مسلمان دیکے بیٹھے رہیں تب بھی ایک سخت مسلمانوں کی ایسی ہوا اُٹھے گی کہ عرب کا بچہ بچہ ان پر دلیر ہو جائے گا اور ان کے لیے ملک بھر میں پھر کوئی جائے پناہ باقی نہ رہے گی۔ اس یاں کے سارے قبائل قریش کے اشاروں پر کام کرنا شروع کر دیں گے۔ مدینہ کے یہودی اور منافقین و مشرکین علی الاعلان سر اٹھائیں گے اور دارالہجرت میں جینا مشکل کر دیں گے۔ مسلمانوں کا کوئی رعب و اثر نہ ہو گا کہ اس کی وجہ سے کسی کو ان کی جان، مال اور آبرو پر ہاتھ ڈالنے میں تامل ہو۔ اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عزم فرمایا کہ جو طاقت بھی اس وقت میسر ہے اسے لے کر نکلیں اور میدان میں فیصلہ کریں کہ جینے کا بل یونہی اس میں ہے اور کس میں نہیں ہے۔

اس فیصلہ کن اقدام کا ارادہ کر کے آپ نے انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے ساری پوزیشن صاف صاف رکھ دی کہ ایک طرف شمال میں تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف جنوب سے قریش کا لشکر چلا آ رہا ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک نہیں مل جائے گا۔ بناؤ تم کس کے مقابلہ پر چلنا چاہتے ہو؟ جواب میں ایک بڑے گروہ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوا کہ قافلے پر حملہ کیا جائے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر ٹھجرا اور تھا اس لیے آپ نے اپنا سوال ڈہرایا۔ اس پر مہاجرین میں سے ثقیف اور بنی نضیر نے اٹھ کر کہا یا رسول اللہ، امض لہما امرک اللہ فانامعک حدیثاً احببت، لانقول ناک کما قال بنو اسرائیل لموسی اذ هب انت وربک فقائلنا اناھلہنا قاعدون، و لکن اذ هب انت وربک فقائلنا انا معکم ما قائلون ما دانت عین منا نظرت، یا رسول اللہ، جدھر آپ کا رہا آپ کو کلم دے۔ ہا ہے اسی طرف چلیے ہم آپ کے

ساتھ میں جس طرف بھی آپ جائیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں
 لڑیں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ نہیں ہم کہتے ہیں کہ چلیے آپ اور آپ کا خدا، دونوں لڑیں اور ہم آپ کے ساتھ
 جائیں لڑائیں گے جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔ مگر لڑائی کا فیصلہ انصار کی رائے
 معلوم کیے بغیر نہیں کیا جاسکتا تھا، کیونکہ ابھی تک فوجی اقدامات میں ان سے کوئی مدد نہیں کی گئی تھی اور
 ان کے لیے یہ آزمائش کا پہلا موقع تھا کہ اسلام کی حمایت کا جو عہد انہوں نے اول روز کیا تھا اسے وہ کہاں
 تک نباتنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے حضور نے براہ راست ان کو مخاطب کیے بغیر پھر اپنا سوال دوہرایا۔
 اس پر سعد بن معاذ اٹھے اور انہوں نے عرض کیا شنایہ حضور کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ فرمایا ہاں۔ انہوں
 نے کہا لقد اماننا بك وصدقناك وشفهدنا ان ما حدثت به هو الحق واعطيناك
 عهودنا و موثيقنا على التمسع والطاعة۔ فامض يا رسول الله لما امرت۔
 فوالذي بعثك بالحق لو استعرضت بنا هذا البحر فخضته لخضناه معك وما
 تخلف منا رجل واحد۔ وما نكره ان تلقى بنا عداونا غداً انا لنصير عند المحروب
 صدقات عند اللقاء ولعل الله يريك منا ما تقر به عينك فسر بنا على بركة الله۔
 "ہم آپ پر ایمان لائے ہیں آپ کی نصیحت کر چکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ سے مطاعت
 کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں پس اسے اللہ کے رسول جو کچھ آپ نے ارادہ فرمایا ہے اسے کر لیں یہ قسم ہے
 اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپ ہمیں لے کر ساتھ سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں
 اتر جائیں تو ہم آپ کے ساتھ کودیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو یہ ہرگز ناکوار نہیں ہے
 کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے، متقابلہ میں بھی جاں نثاری
 دکھائیں گے اور بعد نہیں کہ اللہ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھوادے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں نمندگی ہو جائیں؛
 پس اللہ کی برکت کے بھر دے پر آپ ہمیں لے چلیں۔"

ان تقریروں کے بعد فیصلہ ہو گیا کہ فائدہ کے بجائے لشکر قریش ہی کے متقابلہ پر چلنا چاہیے۔ لیکن یہ
 فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ جو لوگ اس جنگ وقت میں لڑاؤ کے لیے اٹھے تھے ان کی تعداد ۳۰۰ سے کچھ
 زائد تھی (۸۶ ہاجرہ ۶۱۰ قبل مسیح) اور ۷۰ قبیلہ خزرج کے) جن میں صرف دو تین کے پاس گھوڑے
 تھے اور باقی آدمیوں کے لیے ۷۰ اونٹوں سے زیادہ نہ تھے جن پر تین تین چار چار اشخاص باری باری سے
 سوار ہوتے تھے۔ سامان جنگ بھی بالکل ناکافی تھا۔ صرف ۶۰ آدمیوں کے پاس زیریں تھیں۔ اسی لیے چند
 سرفروش فدائیوں کے سوا اکثر آدمی جو اس خطرناک مہم میں شریک تھے دلوں میں سہم رہے تھے اور انہیں
 ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بانٹے ہوئے تھے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ مصلحت پرست لوگ، جو اگرچہ دائرہ
 اسلام میں داخل ہو چکے تھے مگر ایسے ایمان کے قائل نہ تھے جس میں جان و مال کا زریاں ہو، اس مہم کو دہرائی

ایمانی خدا کی طرف سے نصرت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور قریش اپنے سارے غرور طاقت کے باوجود ان بے سرو سامان فدا بیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ ان کے ستر آدمی مارے گئے، ۷۰ قیدی ہوئے اور ان کا سرو سامان غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ قریش کے بڑے بڑے سردار جو ان کے گلہائے سرسبز اور اسلام کی مخالفت تحریک کے روح رواں تھے اس معرکہ میں ختم ہو گئے اور اس فیصلہ کن فتح نے عرب میں اسلام کو ایک قابل لحاظ طاقت بنا دیا۔ جیسا کہ ایک مغربی محقق نے لکھا ہے: "۷۰ بدر سے پہلے اسلام محض ایک مذہب اور ریاست تھا، مگر بدر کے بعد وہ مذہب ریاست بلکہ خود ریاست بن گیا۔"

مباحثہ | یہ ہے وہ عظیم الشان معرکہ جس پر قرآن کی اس سورہ میں تبصرو کیا گیا ہے۔ مگر اس تبصرے کا اعجاز تمام ان تبصروں سے مختلف ہے جو دنیوی بادشاہ اپنی فوج کی فتحیابی کے بعد کیا کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے ان غامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو اخلاقی حیثیت سے اسی مسلمانوں میں باقی تھیں تاکہ آئندہ اپنی مزید تکمیل کے لیے سعی کریں۔

پھر ان کو بتایا گیا ہے کہ اس فتح میں تائید الہی کا کتنا رٹا حصہ تھا تاکہ وہ اپنی جرات و شہامت پر زبردستیں بلکہ خلیفہ نیک اور خدا و رسول کی اطاعت کا سبق لیں۔

پھر اس اخلاقی مقصد کو واضح کیا گیا ہے جس کے لیے مسلمانوں کو یہ معرکہ مخفی و باطل پر یا کرنا ہے اور ان اخلاقی صفات کی توضیح کی گئی ہے جن سے اس معرکہ میں انہیں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

پھر مشرکین اور منافقین اور یہود اور ان لوگوں کو جو جنگ میں قید ہو کر آئے تھے، نہایت سبق آموز انداز میں خطاب کیا گیا ہے۔

پھر ان اموال کے متعلق جو جنگ میں ہاتھ آئے تھے، مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ انہیں اپنا مال نہ سمجھیں بلکہ خدا کا مال سمجھیں، جو کچھ اللہ اس میں سے ان کا حصہ مقرر کرے اسے شکہ کے ساتھ قبول کریں اور جو حصہ اللہ اپنے کام اور اپنے غریب بندوں کی امداد کے لیے مقرر کرے اس کو برصا و رغبت کو ادا کر لیں۔

پھر قانون جنگ و صلح کے متعلق وہ اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں جن کی توضیح اس مرتبے میں دعوت اسلامی کے داخل ہو جانے کے بعد ضروری تھی تاکہ مسلمان اپنی صلح و جنگ میں جاہلیت کے طریقوں سے بچیں اور اور دنیا پران کی اخلاقی برتری قائم ہو اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلام اقول روز سے اخلاقی پر عمل زندگی بنیاد رکھنے کی جو دعوت دے رہا ہے اس کی تعبیر واقعی عمل زندگی میں کیا ہے۔

پھر اسلامی ریاست کے دستوری قانون کی بعض دفعات بیان کی گئی ہیں جن سے دارالاسلام کے مسلمان باشندوں کی آئینی حیثیت ان مسلمانوں سے الگ کر دی گئی ہے جو دارالاسلام کے حدود سے باہر رہتے ہوں۔

سُورَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّةٌ ﴿۱﴾
 آیاتہا ۵۵
 بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ
 فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ
 اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ

تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں، کہو "یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول کے ہیں، پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔" سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر

سہ اس زبیرہ جنگ کی عجیب تمہید ہے۔ بدر میں جو مال غنیمت لشکر قریش سے لوٹا گیا تھا اس کی تقسیم پر مسلمانوں کے درمیان نزاع برپا ہو گئی۔ چونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں کو پہلی مرتبہ پرچم اسلام کے نیچے لڑنے کا اتفاق ہوا تھا اس لیے ان کو معلوم نہ تھا کہ اس سلسلے میں جنگ اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے متعلق کیا ضابطہ ہے۔ کچھ ابتدائی بدایات سورہ بقرہ اور سورہ محمد میں دیکھی جا چکی تھیں۔ لیکن "تہذیب جنگ کی بنیاد ابھی کھنی باقی تھی۔ بہت سے تمدنی معاملات کی طرح مسلمان ابھی تک جنگ کے معاملہ میں بھی اکثر بڑائی جاہلیت ہی کے تصورات لیے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے بدر کی لڑائی میں کفار کی شکست کے بعد جن لوگوں نے جو جو کچھ مال غنیمت لوٹا تھا وہ عرب کے پڑانے طریقہ کے مطابق اپنے آپ کو اس کا مالک سمجھ بیٹھے تھے۔ لیکن ایک دوسرا فرقہ جس نے غنیمت کی طرف رخ کرنے کے بجائے کفار کا تعاقب کیا تھا، اس بات کا مدعی ہوا کہ اس مال میں ہمارا برابر کا حصہ ہے۔ کیونکہ اگر ہم دشمن کا پیچھا کر کے اسے دیر تک بھگانا دیتے اور تمہاری طرح غنیمت پر ٹوٹ پڑتے تو ممکن تھا کہ دشمن پھر پیدٹ کر حملہ کر دیتا اور فتح شکست سے بدل جاتی۔ ایک تیسرے فریق نے بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہا تھا، اپنے رعایا پیش کیے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ سب سے بڑھ کر قیمتی خدمت تو اس جنگ میں ہم نے انجام دی ہے۔ اگر ہم رسول اللہ کے گرد اپنی جانوں کا حصار بنائے ہوئے نہ رہتے اور آپ کو کوئی گزند پہنچ جاتا تو فتح ہی کب نصیب ہو سکتی تھی کہ کوئی مال غنیمت ہاتھ آتا اور اس کی تقسیم کا سوال اٹھتا۔ مگر مال عملاً جس فریق کے قبضہ میں تھا اس کی ملکیت کو یا کسی شہرت کی محتاج نہ تھی اور وہ دلیل کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ ایک امر واقعی اس کے زور سے بدل جائے۔ آخر کار اس نزاع نے تلخی کی صورت اختیار کرنی شروع کر دی اور زبیرہ جنگ سے دونوں تک بدرمگی پھیلنے لگی۔

یہ تعداد نفسیاتی موقع جسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ انفال نازل کرنے کے لیے منتخب فرمایا اور جنگ پر اپنے نبی سے کی ابتدا اسی مسئلے سے کی۔ پھر پہلا ہی فقرہ جو ارشاد ہوا اسی میں سوال کا جواب موجود تھا فرمایا ”تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں“ یہ ان اموال کو ”غنائم“ کے بجائے ”انفال“ کے لفظ سے تعبیر کرنا بجائے خود مسئلے کا فیصلہ اپنے اندر رکھنا تھا۔ انفال جمع ہے نفل کی۔ عربی زبان میں نفل اس چیز کو کہتے ہیں جو واجب سے یا حق سے زائد ہو۔ جب یہ نزاع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ زلفہ کا لاندہ خدمت ہوتی ہے جو ایک بندہ اپنے آقا کے لیے فرض سے بڑھ کر نطووعاً بجا لاتا ہے۔ اور جب یہ منبوع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ عطیہ و انعام ہوتا ہے جو آقا اپنے بندے کو اس کے حق سے زائد دیتا ہے۔ پس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ساری رد و کد، یہ نزاع، یہ پوچھ گچھ کیا خدا کے بخشے ہوئے انعامات کے بارے میں جو رہی ہے؟ اگر یہ بات ہے تو تم لوگ ان کے مالک و مختار کماں بنے جا رہے ہو کہ خود ان کی تقسیم کا فیصلہ کرو۔ مال جس کا بخشا ہوا ہے وہی فیصلہ کرے گا کہ دیا جائے اور کسے نہیں، اور جس کو بھی دیا جائے اسے کتنا دیا جائے۔

یہ جنگ کے سلسلہ میں ایک بہت بڑی اخلاقی اصلاح تھی۔ مسلمان کی جنگ دنیا کے مادی فائدے سے بٹورنے کیلئے نہیں ہے بلکہ دنیا کے اخلاقی و تمدنی بگاڑ کو اصول حق کے مطابق درست کرنے کے لیے ہے جسے مجبوراً اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جبکہ مزاحم قوتیں دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے اصلاح کو ناممکن بنا دیں۔ پس صلحین کی نظر اپنے مقصد پر ہونی چاہیے نہ کہ ان فوائد پر جو مقصد کے لیے سہی کرتے ہوئے بطور انعام خدا کی عنایت سے حاصل ہوں۔ ان فوائد سے اگر ابتدا ہی میں ان کی نظر نہ ہٹا دی جائے تو بہت جلدی اخلاقی انحطاط رونما ہو کر یہی فوائد مقصد و قرار پا جائیں۔

پھر یہ جنگ کے سلسلہ میں ایک بہت بڑی انتظامی اصلاح بھی تھی۔ قدیم زمانہ میں طریقہ یہ تھا کہ جو مال جس کے ہاتھ لگتا وہی اس کا مالک قرار پاتا۔ یا پھر بادشاہ یا سپہ سالار تمام غنائم پر غالب ہو جاتا۔ پہلی صورت میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ فتح باب فوجوں کے درمیان اموال غنیمت پر سخت تنائس رہتا جو جاتا اور بسا اوقات ان کی خاندان جگلی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیتی۔ دوسری صورت میں سپاہیوں کو چوری کا عارضہ لگ جاتا تھا اور وہ غنائم کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن نے انفال کو اللہ اور رسول کا مال قرار دے کر پہلے تو یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ تمام مال غنیمت لاکر بے کم و کاست امام کے سامنے رکھ دیا جائے اور ایک سو فی صد چھپا کر نہ رکھی جائے۔ پھر آگے چل کر اس مال کی تقسیم کا قانون بنا دیا کہ پانچواں حصہ خدا کے کام اور اس کے فریب بندوں کی مدد کے لیے بیت المال میں رکھ لیا جائے اور باقی چار حصے اُس پوری فوج میں تقسیم کر دیے جائیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو۔ اس طرح وہ دونوں حرا بیاں دور ہو گئیں جو جاہلیت کے طریقہ میں تھیں۔

اس مقام پر ایک لطیف نکتہ اور بھی ذہن میں رہنا چاہیے۔ میان انفال کے قصے کو صرف اتنی بات کہہ کر ختم کر دیا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے ہیں۔ تقسیم کے مسئلے کو یہاں نہیں چھیڑا گیا تاکہ پہلے تسلیم و اطاعت مکمل ہو جائے۔ پھر چند رکوع کے بعد بتایا گیا کہ ان اموال کو تقسیم کس طرح کیا جائے۔ اسی لیے یہاں انہیں ”انفال“ کہا گیا ہے اور رکوع میں جب تقسیم کا حکم بیان کرنے کی نوبت آئی تو انہی اموال کو ”غنائم“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

وَجَلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا
 وَعَلَىٰ سَرِيهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۲﴾ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا
 رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۳﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ
 دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۴﴾ كَمَا أَخْرَجَكَ

رز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا
 ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں
 (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس
 بڑے درجے ہیں، قصوروں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔ (اس مالِ غنیمت کے معاملہ میں
 بھی ویسی ہی صورت پیش آ رہی ہے جیسی اُس وقت پیش آئی تھی جبکہ تیرا رب تجھے حق کے ساتھ

۲ یعنی ہر ایسے موقع پر جب کوئی حکم الہی آدمی کے سامنے آئے اور وہ اس کی تصدیق کر کے سرطاعت چھلا کر
 آدمی کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر اس موقع پر جب کہ کوئی چیز آدمی کی مرضی کے خلاف، اس کی رائے اور نصیحتات و نظریات
 کے خلاف، اس کی مانوس عادتوں کے خلاف، اس کے مفاد اور اس کی لذت و آسائش کے خلاف، اس کی محبتوں اور دوستیوں کے
 خلاف، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت میں ملے اور آدمی اس کو مان کر فرمان خدا اور رسول کو بدلفظ کے بجائے اپنے
 آپ کو بدل ڈالے اور اس کی قبولیت میں تکلیف انگیز کرے تو اس سے آدمی کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے
 برعکس اگر ایسا کرنے میں آدمی دیرینہ کرے تو اس کے ایمان کی جان بکھنی شروع ہو جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ساکن و
 جامد چیز نہیں ہے، اور تصدیق و عدم تصدیق کا بس ایک ہی ایک مرتبہ نہیں ہے کہ اگر آدمی نے نہ مانا تو وہ بس ایک ہی نہ مانا رہا، اور
 اگر اس نے مان لیا تو وہ بھی بس ایک ہی مان لینا ہوا۔ نہیں بلکہ تصدیق اور انکار دونوں میں انحطاط اور نشوونما کی صلاحیت ہے۔
 ہر انکار کی کیفیت گھٹ بھی سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے۔ اور اسی طرح ہر اقرار و تصدیق میں ارتقاء بھی ہو سکتا ہے اور تنزلی
 بھی۔ البتہ فقہی احکام کے اعتبار سے نظام تمدن میں حقوق اور حیثیات کا تعین جب کیا جائے گا تو تصدیق اور عدم تصدیق دونوں
 کے بس ایک ہی مرتبے کا اعتبار کیا جائے گا۔ اسلامی سوسائٹی میں تمام ماننے والوں کے آئینی حقوق و واجبات یکساں
 ہوں گے خواہ ان کے درمیان ماننے کے مراتب میں کتنا ہی تفاوت ہو۔ اور سب نہ ماننے والے ایک ہی مرتبے میں دی

رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكِرْهُونَ ۗ
يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ
وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۖ ۝۱۳۱ وَاذِيعِدْكُمْ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنهَآ

تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ سخت ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے درانِ حالے کہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکنے جا رہے ہیں۔

یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں

باجدلی یا معاہدہ سالم قرار دے جائیں گے خواہ ان میں کفر کے اعتبار سے مراتب کا کتنا ہی فرق ہو۔

۱۳۱ تصور بڑے سے بڑے اور بہتر سے بہتر اہل ایمان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں اور جب تک انسان انسان ہے یہ حال ہے کہ اس کا نامہ اعمال سراسر مجبوری کا رناموں ہی پر مشتمل ہو اور لغزش، کوتاہی، غامی سے بالکل خالی رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے یہ بھی ایک بڑی رحمت ہے کہ جب انسان بندگی کی لازمی شرائط پوری کر دیتا ہے تو اللہ اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی فرماتا ہے اور اس کی خدمات جس صلے کی مستحق ہوتی ہیں اس سے کچھ زیادہ صلہ اپنے فضل سے عطا کرتا ہے۔ سوز اگر قاعدہ یہ مقرر کیا جاتا کہ ہر قصور کی سزا اور ہر خدمت کی جزا الگ الگ دی جائے تو کوئی بڑے سے بڑا صالح بھی سزا سے بچ سکتا۔

۱۳۲ یعنی جس طرح اُس وقت یہ لوگ خطرے کا سامنا کرنے سے گھبرارے تھے حالانکہ حق کا مطالبہ اُس وقت یہی تھا کہ خطرے کے منہ میں چلے جائیں، اسی طرح آج انہیں مالِ غنیمت ہاتھ سے چھوڑنا ناگوار ہو رہا ہے حالانکہ حق کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اسے چھوڑیں اور حکم کا انتظار کریں۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ کی اطاعت کرو گے اور اپنے نفس کی خواہش کے بجائے رسول کا کمانو گے تو ویسا ہی اچھا نتیجہ دیکھو گے جیسا ابھی جنگ بدر کے موقع پر دیکھ چکے ہو کہ نہیں شکر تشریف کے مقابلہ پر جانا سخت ناگوار تھا اور اسے تم ہلاکت کا بیخام سمجھ رہے تھے لیکن جب تم نے حکم خدا و رسول کی تعمیل کی تو یہی خطرناک کام تمہارے لیے زندگی کا بیخام ثابت ہوا۔

قرآن کا یہ ارشاد ضمناً اُن روایات کی بھی تردید کر رہا ہے جو جنگ بدر کے سلسلہ میں عموماً کتب سیرت و معاری میں نقل کی جاتی ہیں، یعنی یہ کہ ابتداً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین قافلے کو ٹوٹنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ پھر چند منزل آگے جا کر جب معلوم ہوا کہ قریش کا لشکر قافلہ کی حفاظت کے لیے آ رہا ہے تب یہ مشورہ کیا گیا کہ قافلے پر حملہ کیا جائے یا

لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَةِ تَكُونَ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ
 أَنْ يُثَبِّتَ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۝ لِيُثَبِّتَ الْحَقَّ
 وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ
 فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِالْفِئَةِ مِنَ الْمَلِكَةِ مُرَدِّفِينَ ۝
 وَمَا جَعَلَ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْبِئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا

دل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے
 حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے
 خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں
 تمہاری مدد کے لیے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔ یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لیے
 بتادی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں اور نہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ

شکر کا مقابلہ ہاں بیان کے برعکس قرآن یہ بتا رہا ہے کہ جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے نکلے تھے اسی وقت یہ امر حق
 آپ کے پیش نظر تھا کہ قریش کے لشکر سے فیصلہ کن مقابلہ کیا جائے۔ اور یہ مشاورت بھی اسی وقت ہوئی تھی کہ قافلے اور لشکر
 میں سے کس کو حملہ کے لیے منتخب کیا جائے۔ اور باوجودیکہ مونہیں پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ لشکر ہی سے منشا ضروری ہے،
 پھر بھی ان میں سے ایک گروہ اس سے بچنے کے لیے جلت کرتا رہا اور بالآخر جب آخری رائے یہ قرار پائی کہ لشکر ہی کی طرف
 چلنا چاہیے تو یہ گروہ مدینہ سے بیجاں کرنا ہوا چلا کہ ہم سیدھے موت کے منہ میں ہانکے جا رہے ہیں۔

۵۵ یعنی بخاری قافلہ بالشکر قریش۔

۵۶ یعنی قافلہ جس کے ساتھ صرف تیس چالیس محافظ تھے۔

۵۷ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت فی الواقع صورت حال کیا رہنا ہو گئی تھی۔ جیسا کہ ہم نے سورہ کے
 دیباچہ میں بیان کیا ہے، لشکر قریش کے نکل آنے سے دراصل سوال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ دعوت اسلامی اور نظام جاہلیت دونوں
 ہیں سے کس کو عرب میں زندہ رہنا ہے۔ اگر مسلمان اس وقت مردانہ وار مقابلہ کے لیے نہ نکلتے تو اسلام کے لیے زندگی کا کوئی موقع



مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝۱۰ إِذْ يَغِيثِكُمُ النَّعَاسَ أَمَنَةً
مِّنْهُ وَيُنزِلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ
عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ
الْأَقْدَامَ ۝۱۱ إِذْ يُوحَىٰ رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا
الَّذِينَ آمَنُوا سَأَلْتُ فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَأَصْرَبُوا

ہی کی طرف سے ہوتی ہے، یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے۔ ع۔

اور وہ وقت جبکہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا، اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برس رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجات دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعہ سے تمہارے قدم جمادے۔

اور وہ وقت جبکہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو، میں بھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں، پس تم ان کی

باقی ذر بتنا۔ بحالات اس کے مسلمانوں کے نکلنے اور پہلے ہی بھر پور وار میں قریش کی طاقت پر کاری جوٹ لگا دینے سے وہ حالات پیدا ہوئے جن کی بدولت اسلام کو قدم جمانے کا موقع مل گیا اور پھر اس کے مقابلہ میں نظام جاہلیت پیہم شکست کھانا ہی چلا گیا۔
۱۰ یہی تجربہ مسلمانوں کو اُحد کی جنگ میں پیش آیا جیسا کہ سورہ آل عمران آیت ۱۵۴ میں گزر چکا ہے۔ اور دونوں مواقع پر وجہ وہی ایک تھی کہ جو موقع شدتِ خوف اور گھبراہٹ کا تھا اس وقت اللہ نے مسلمانوں کے دلوں کو ایسے اطمینان سے بھر دیا کہ ان پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

۱۱ یہ اس رات کا واقعہ ہے جس کی صبح کو بدر کی لڑائی پیش آئی۔ اس بارش کے تین فائدے ہوئے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کو پانی کی کافی مقدار مل گئی اور انہوں نے فوراً حوض بنا کر بارش کا پانی روک لیا۔ دوسرے یہ کہ مسلمان چونکہ وادی کے بالائی حصے پر تھے اس لیے بارش کی وجہ سے ریت جم گئی اور زمین اتنی مضبوط ہو گئی کہ قدم اچھی طرح جم سکیں اور نقل و حرکت آسانی ہو سکے۔ تیسرے یہ کہ لشکر کفار خبیث کی جانب تھا اس لیے وہاں اس بارش کی بدولت کچھ ٹھوگئی اور

فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاصْرَبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ذَلِكُمْ بِأَنَّهُمْ
شَاقُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذَلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ
النَّارِ ﴿۱۴﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحَفًا فَلَا
تُلَاقُوهُمْ إِلَّا دُبَابًا سَرًّا ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُلَاقِهِمْ يَوْمَئِذٍ فَدُبُرًا إِلَّا الْمُتَحَرِّفًا

گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔ یہ اس لیے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کا
مقابلہ کیا اور جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرے اللہ اس کے لیے نہایت سخت گیر
ہے۔ یہ ہے تم لوگوں کی سزا اب اس کا مزہ چکھو اور تمہیں معلوم ہو کہ حق کا انکار کرنے
والوں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔

اے ایمان لانے والو، جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے
مقابلہ میں پیٹھے نہ پھیرو۔ جس نے ایسے موقع پر پیٹھے پھیری۔ اَللّٰہِیہ کہ جنگی چال کے طور پر

پاؤں دھسنے لگے۔

شیطان کی ڈالی ہوئی خواہش سے مراد وہ ہراس اور گھبراہٹ کی کیفیت تھی جس میں مسلمان ابتداء مبتلا تھے۔
اللہ جو اصولی باتیں ہم کو قرآن کے ذریعہ سے معلوم ہیں ان کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فرشتوں سے قتال میں یہ کام
نہیں لیا گیا ہو گا کہ وہ خود حرب و ضرب کا کام کریں، بلکہ شاید اس کی صورت یہ ہوگی کہ کفار پر جو ضرب مسلمان لگائیں وہ فرشتوں
کی مدد سے ٹھیک بیٹھے اور کاری لگے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اللہ یہاں تک جنگ بدر کے جن واقعات کو ایک ایک کر کے یاد دلایا گیا ہے اس سے مقصود دراصل لفظ
”انفال“ کی معنویت واضح کرنا ہے۔ ابتدا میں ارشاد ہوا تھا کہ اس مال غنیمت کو اپنی جانفشانی کا ثمرہ سمجھ کر اس کے مالک و
مقتار کہاں بنے جاتے ہو، یہ تو دراصل عظیمہ الہی ہے اور معنی خود ہی اپنے مال کا مختار ہے۔ اب اس کے ثبوت میں یہ
واقعات گنائے گئے ہیں کہ اس فتح میں خود ہی حساب لگا کر دیکھ لو کہ تمہاری اپنی جانفشانی اور جرات و جسارت کا کتنا حصہ تھا اور
اللہ کی عنایت کا کتنا حصہ۔

لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّرًا إِلَىٰ فِتْنَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَ
 مَا أُوذِيَ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ
 اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ سَرَّ وَأَنْ لَّيْلِي
 الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءٌ حَسَنًا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۷﴾

ایسا کہے یا کسی دوسری فوج سے جاننے کے لیے۔۔۔ تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائیگا
 اُس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ بہت بُری جائے بازگشت ہے۔

پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور تو نے نہیں
 پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کیے گئے) تو یہ اس لیے تھا
 کہ اللہ مومنوں کو ایک بہتر میں آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزارے، یقیناً اللہ سُننے اور جاننے والا ہے۔

۱۶۔ خطاب کا رخ یکایک کفار کی طرف پھر گیا ہے جن کے سخت سزا ہونے کا ذکر اوپر کے فقرے میں ہوا تھا۔
 ۱۷۔ دشمن کے شدید ریزا پر مرتب پسپائی (Orderly retreat) نام جائز نہیں ہے جبکہ اس کا مقصد اپنے
 عقبی مرکز کی طرف پلٹنا یا اپنی ہی فوج کے کسی دوسرے حصہ سے جا ملنا ہو۔ البتہ جو چیز حرام کی گئی ہے وہ بھگدڑ (Rout)
 ہے جو کسی جنگی مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض بزدلی و شکست خوردگی کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس لیے ہوا کرتی ہے کہ بھگدڑ سے
 آدمی کو اپنے مقصد کی بہ نسبت جان زیادہ پیاری ہوتی ہے اس فرار کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ
 وسلم فرماتے ہیں کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی، ایک شرک، دوسرے والدین کی حق تلفی، تیسرے
 میدان قتال فی سبیل اللہ سے فرار۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آپ نے سات بڑے گناہوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کے لیے
 تباہ کن اور اس کے انجامِ اخروی کے لیے غارتگر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ گناہ بھی ہے کہ آدمی کفر و اسلام کی جنگ میں کفار کے
 آگے پیٹھ پھیر کر بھاگے اس فعل کو تباہ کن گناہ فرار دینے کی وجہ صرف ہی نہیں ہے کہ یہ ایک بزدلانہ فعل ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے
 کہ ایک شخص کا بھگدڑا پن بسا اوقات ایک پوری پلٹن کو، اور ایک پلٹن کا بھگدڑا پن ایک پوری فوج کو بدتراس کر کے بھاگا دیتا ہے۔
 اور پھر جب ایک دفعہ کسی فوج میں بھگدڑ پڑ جائے تو کما نہیں جاسکتا کہ تباہ کن اس حد پر جا کر ٹھہرے گی اس طرح کی بھگدڑ صرف فوج
 ہی کے لیے تباہ کن نہیں ہے بلکہ اس ملک کے لیے بھی تباہ کن ہے جس کی فوج ایسی شکست کھائے۔

ذَلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۸﴾ إِنَّ تَسْتَفْتِحُوا
فَقَدْ جَاءَكُمْ الْفَتْحُ وَإِنْ تَسْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَإِنْ
تَعُدُّوا نَعْدٌ وَلَنْ نَغْفِي عَنْكُمْ فَعَيْتُكُمْ شَيْئًا وَلَا كَثُرَتْ
وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۹﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِّيعُوا
اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ﴿۲۰﴾
وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۲۱﴾

یہ معاملہ تو تمہارے ساتھ ہے اور کافروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے۔ ان کافروں سے کہہ دو "اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو، فیصلہ تمہارے سامنے آگیا۔ اب باز آ جاؤ تو تمہارے ہی لیے بہتر ہے، ورنہ پھر پیٹ کر اسی حماقت کا اعادہ کرو گے تو ہم بھی اسی مزا کا اعادہ کریں گے اور تمہاری جمعیت، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، تمہارے کچھ کام نہ آسکے گی۔ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔" ع

اسے ایمان لانے والو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور حکم سننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔

۱۴ معرکہ بدر میں جب مسلمانوں اور کفار کے لشکر ایک دوسرے کے منقابل ہوئے اور عام زور و شور کا موقع آگیا تو حضور نے مٹی بھر ریت ہاتھ میں لے کر نشاہت الوُجُو کا کتے ہوئے کفار کی طرف پھینکی اور اس کے ساتھ ہی آپ کے اشارے سے مسلمان یکبارگی کفار پر حملہ آور ہوئے۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

۱۵ مکہ سے روانہ ہوتے وقت مشرکین نے کعبہ کے پردے پر کڑوا کر دعا مانگی تھی کہ خلیا دونوں گروہوں میں سے جو بہتر ہے اس کو فتح عطا کر اور ابو جہل نے خاص طور پر کہا تھا کہ خلیا ہم میں سے جو بر سر حق ہو اسے فتح دے اور جو بر سر ظلم ہو اسے روم کر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی منگائی دعائیں صرف بھرت پوری کر دیں اور فیصلہ کر کے بتا دیا کہ دونوں میں سے کون اچھا اور

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۲۲﴾
 وَ لَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَآسَمِعَهُمْ وَ لَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَ
 هُمْ مُعْرِضُونَ ﴿۲۳﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَ لِلرَّسُولِ
 إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ وَ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ
 وَ قَلْبِهِ وَ أَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۲۴﴾ وَ اتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ

یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ ہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ اگر
 اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے تو وہ ضرور انہیں سننے کی توفیق دیتا (لیکن بھلائی کے بغیر)
 اگر وہ ان کو سنو تا تو وہ بے رنجی کے ساتھ منہ پھیر جاتے۔

اے ایمان لانے والو، اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس
 چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے
 درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ اور جو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر

برسر حق ہے۔

۱۶۔ بہانہ سننے سے مراد وہ منہ ہے جو ماننے اور قبول کرنے کے معنی میں ہوتا ہے۔ اشارہ ان منافقین کی طرف
 ہے جو ایمان کا اقرار تو کرتے تھے مگر احکام کی اطاعت سے منہ موڑ جاتے تھے۔

۱۷۔ یعنی جو نہ حق سنتے ہیں نہ حق روکتے ہیں۔ جن کے کان اور جن کے منہ حق کے لیے ہرے اور گونگے ہیں۔
 ۱۸۔ یعنی جب ان لوگوں کے اندر خود حق پرستی اور حق کے لیے کام کرنے کا جذبہ نہیں ہے تو انہیں اگر تعیل حکم میں
 جنگ کے لیے نکل آنے کی توفیق دے بھی دی جاتی تو یہ خطرے کا موقع دیکھتے ہی بے تکلف بھاگ نکلنے اور ان کی ہمت نہ مارنے
 لیے مفید ثابت ہونے کے بجائے الٹی مضر ثابت ہوتی۔

۱۹۔ نفاق کی روش سے انسان کو بچانے کے لیے اگر کوئی سب سے زیادہ مؤثر ذمہ داری ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دو عقیدے
 انسان کے ذہن نشین ہو جائیں۔ ایک یہ کہ معاملہ اُس خدا کے ساتھ ہے جو دلوں کے حال تک جانتا ہے اور ایسا لڑواں ہے
 کہ آدمی اپنے دل میں جو چیزیں جو خواہشیں جو اعتراض و مفاد اور جو خیالات چھپا کر رکھتا ہے وہ بھی اس پر عیاں ہیں۔ دوسرے

الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ
الْعِقَابِ ﴿۱۵﴾ وَأَذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي
الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمُ

صرف اُنہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹانے میں پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ جیتا کر دی، اپنی مدد سے

یہ کہ جانا بہر حال خدا کے سامنے ہے اس سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ یہ دو عقیدے جتنے زیادہ پختہ ہوں گے اتنا ہی انسان نفاق سے دور رہے گا۔ اسی لیے منافقت کے خلاف وعظ و نصیحت کے سلسلے میں قرآن ان دو عقیدوں کا ذکر بار بار کرتا ہے۔

۱۵۔ اس سے مراد وہ اجتماعی فتنے ہیں جو دہائے عام کی طرح ایسی شامت لاتے ہیں جس میں صرف گناہ کرنے والے ہی گرفتار نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ بھی مارے جاتے ہیں جو گناہ کا سوسائٹی میں رہنا نورا کرتے رہے ہوں۔ مثال کے طور پر پلاس کو یوں سمجھیے کہ جب تک کسی شہر میں گندگیاں کہیں کہیں انفرادی طور پر چند مقامات پر رہتی ہیں، ان کا اثر محدود رہتا ہے اور ان سے وہ مخصوص افراد ہی متاثر ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے جسم اور اپنے گھر کو گندگی سے آلودہ کر رکھا ہو۔ لیکن جب وہاں گندگی عام ہو جاتی ہے اور کوئی گروہ بھی سارے شہر میں ایسا نہیں ہوتا جو اس خرابی کو روکنے اور صفائی کا انتظام کرنے کی سعی کرے تو پھر ہوا اور زمین اور پانی ہر چیز میں سمیت پھیل جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں جو دبا آتی ہے اس کی لپیٹ میں گندگی پھیلانے والے اور گندہ رہنے والے اور گندہ ماحول میں زندگی بسر کرنے والے سب ہی آجاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی جماعتوں کا حال بھی ہے کہ گروہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور صالح سوسائٹی کے رعبے دہی رہیں تو ان کے نقصانات محدود رہتے ہیں۔ لیکن جب سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کمزور ہو جاتا ہے، جب اخلاقی برائیوں کو دبا کر رکھنے کی طاقت اُس میں نہیں رہتی، جب اس کے درمیان بڑے اور بے حیا اور بیدار اخلاق لوگ اپنے نفس کی گندگیوں کو علانیہ اچھا لنے اور پھیلانے لگتے ہیں اور جب اچھے لوگ بے عملی اور (Passive attitude) اختیار کر کے اپنی انفرادی اچھائی پر فخر اور اجتماعی برائیوں پر سکت و صامت ہو جاتے ہیں، تو مجموعی طور پر پوری سوسائٹی کی شامت آجاتی ہے اور وہ فتنہ عام برپا ہوتا ہے جس میں چپنے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ رسول جس اصلاح و ہدایت کے کام کے لیے اٹھتا ہے اور تمہیں جس خدمت میں ہاتھ بٹانے کے لیے بلا رہا ہے اسی میں درحقیقت شخصی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تمہارے لیے زندگی ہے۔ اگر اس میں کچھ دل سے غلغلہ نہ حمد نہ لوگے اور ان برائیوں کو جو سوسائٹی میں پھیلی ہوئی ہیں برداشت کرتے رہو گے تو وہ فتنہ عام برپا ہوگا

بِنَصْرِهِ وَ سَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۳۶﴾ يَا أَيُّهَا
الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمْنَكُمْ وَانْتُمْ
تَعْلَمُونَ ﴿۳۷﴾ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ

تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔ اسے ایمان لانے والوں،
جاتے ہو جھٹے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو، اپنی امانتوں میں غلاری کے مرتکب
نہ ہو اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد و خفیت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے

جس کی آفت سب کو لپیٹ میں لے لے گی خواہ بہت سے افراد تمہارے درمیان ایسے موجود ہوں جو عملاً برائی کرنے اور برائی
پھیلانے کے ذمہ دار نہ ہوں، بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھلائی ہی ایسے ہوئے ہوں۔ یہ وہی بات ہے جس کو سورہ اعراف آیات
۱۶۲-۱۶۶ میں اصحاب السبت کی تاریخی مثال پیش کرتے ہوئے بیان کیا جا چکا ہے اور یہی وہ نقطہ نظر ہے جسے اسلام کی اصلاحی
جنگ کا بنیادی نظریہ کہا جا سکتا ہے۔

۲۱۔ یہاں شکر گزاری کا لفظ غور کے قابل ہے۔ اور پر کے سلسلہ فقرہ کو نظر میں رکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے
کہ اس موقع پر شکر گزاری کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ لوگ اللہ کے اس احسان کو مانیں کہ اس نے اس کمزوری کی حالت سے
انہیں نکالا اور مکہ کی پرخطر زندگی سے بچا کر اس کی جگہ لے آیا جہاں طیبات رزق میسر ہو رہے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بات بھی
اسی شکر گزاری کے مفہوم میں داخل ہے کہ مسلمان اس غلہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کریں جس نے یہ احسانات ان پر کیے
ہیں، اور رسول کے مشن میں اخلاص و جان نثاری کے ساتھ کام کریں، اور اس کام میں جو خطرات و ممانک اور مصائب پیش
آئیں ان کا مردانہ دار مقابلہ اسی خدا کے بھروسے پر کرتے چلے جائیں جس نے اس سے پہلے ان کو خطرات سے بعینت نکالا
ہے، اور یقین رکھیں کہ جب وہ خدا کا کام اخلاص کے ساتھ کریں گے تو خدا ضرور ان کا دکیل و کفیل ہو گا۔ پس شکر گزاری محض اعترافی
نوعیت ہی کی مطلوب نہیں ہے بلکہ عملی نوعیت کی بھی مطلوب ہے۔ احسان کا اعتراف کرنے کے باوجود جس کی رضا جوئی
کے لیے سعی نہ کرنا اور اس کی خدمت میں مخلص نہ ہونا اور اس کے بارے میں یہ شک رکھنا کہ نہ معلوم آئندہ بھی وہ احسان کریگا
یا نہیں، ہرگز شکر گزاری نہیں ہے بلکہ اٹھی ناشکری ہے۔

۲۲۔ اپنی امانتوں سے مراد وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جو کسی پر اعتباراً (Trust) کر کے اس کے سپرد
کی جائیں، خواہ وہ عہد وفا کی ذمہ داریاں ہوں یا اجتماعی معاہدات کی، یا جماعت کے رازدوں کی، یا شخصی و اجتماعی اموال
کی، یا کسی ایسے عمدہ و منصب کی جو کسی شخص پر بھروسہ کرتے ہوئے جماعت اس کے حوالے کرے۔ مزید تشریح کے لیے

عِنْدَكَ اجْرُ عَظِيمٌ ﴿۳۸﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ
يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۳۹﴾ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا

پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے، اسے ایمان لانے والو، اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے لیے کسوٹی بھرنے والے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے دور کرے گا اور تمہارے قصور معاف کرے گا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے

ملاحظہ ہو سورہ نساء، عاشرہ صفحہ ۵۵

۳۳ انسان کے اخلاص ایمانی میں جو چیز یا عموم محل ڈالنی ہے اور جس کی وجہ سے انسان اکثر منافقت، غماری اور خیانت میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے مالی مفاد اور اپنی اولاد کے مفاد سے اس کی حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی ہوتی ہے ساسی لیے فرمایا کہ یہ مال اور اولاد جن کی محبت میں گرفتار ہو کر تم عموماً راستی سے ہٹ جاتے ہو، دراصل یہ دنیا کی امتحان گاہ ہیں تمہارے لیے سامان آزمائش ہیں۔ جسے تم دنیا یا دنیا کی چیزوں سے حقیقت کی زبان میں وہ دلائل امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اور جسے تم جاننا یا کاروبار کہتے ہو وہ بھی درحقیقت ایک دوسرا پرچہ امتحان ہے۔ یہ چیزیں تمہارے حوالہ کی ہیں اس لیے گئی ہیں کہ ان کے ذریعہ سے تمہیں جانچ کر دیکھا جائے کہ تم کہاں تک حقوق اور حدود کا لحاظ کرتے ہو، کہاں تک ذمہ داریوں کا بوجھ لادو گے، ہوسے جذبات کی کشش کے باوجود راہ راست پر چلتے ہو، اور کہاں تک اپنے نفس کو جو ان چیزوں کی محبت میں لیر ہوتا ہے، اس طرح قابو میں رکھتے ہو کہ پوری طرح بندہ حق بھی بنے رہو اور ان چیزوں کے حقوق اس حد تک ادا بھی کرتے رہو جس حد تک حضرت حق نے خود ان کا استحقاق مقرر کیا ہے۔

۳۴ کسوٹی اُس چیز کو کہتے ہیں جو کھر سے اور کھوٹے کے امتیاز کو نمایاں کرتی ہے، یہی مفہوم "فرقان" کا بھی ہے اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ اس لفظ سے کیا ہے۔ ارشاد الہی کا منشا یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو اور تمہاری دنیا خواہش یہ ہو کہ تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوئے پائے جو رضائے الہی کے خلاف ہو، تو اللہ تعالیٰ تمہارے اندر وہ قوت تیز پیدا کر دے گا جس سے قدم قدم پر تمہیں خود یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ کونسا دروغ ہے اور کونسا غلط کس دروغ میں خدا کی رضائے اور کس میں اس کی ناپااضی۔ زندگی کے ہر موڑ پر دور رہو، ہر نشیب اور ہر فراز پر تمہاری اندرونی بصیرت تمہیں بتائے گی کہ کدھر قدم اٹھانا چاہیے اور کدھر مٹھانا چاہیے، کونسی راہ حق ہے اور خدا کی طرف جاتی ہے اور کونسی راہ باطل

لِيَتَّبِعُوا أَوْ يَقْتُلُوا أَوْ يُخْرِجُوا وَيَمْكُرُوا وَيَمْكُرُوا وَيَمْكُرُوا
 اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرُومِينَ ﴿۳۰﴾ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا
 قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا إِنْ هَذَا إِلَّا

کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال
 چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی تھیں
 تو کہتے تھے کہ ہاں سن لیا ہم نے، ہم چاہیں تو ایسی ہی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں، یہ تو وہی پُرانی

ہے اور شیطان سے ملاتی ہے۔

۲۵ یہ اس موقع کا ذکر ہے جبکہ قریش کا یہ اندیشہ یقین کی حد کو پہنچ چکا تھا کہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ چلے
 جائیں گے۔ اس ذمت دہ آپس میں کہنے لگے کہ اگر یہ شخص مکہ سے نکل گیا تو پھر خطرہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائے گا چنانچہ انہوں نے
 آپ کے معاملہ میں ایک آخری فیصلہ کرنے کے لیے دارالندوۃ میں تمام رؤساء قوم کا ایک اجتماع کیا اور اس امر پر باہم مشاورت
 کی کہ اس خطرے کا سدباب کس طرح کیا جائے۔ ایک فریق کی رائے یہ تھی کہ اس شخص کو بیڑیاں پہنا کر ایک جگہ قید کر دیا جائے اور
 جیتے جی رہا نہ کیا جائے۔ لیکن اس رائے کو قبول نہ کیا گیا کیونکہ کھنڈے والوں نے کہا کہ اگر ہم نے اسے قید کر دیا تو اس کے جو ساتھی قید خانے
 سے باہر ہو گئے وہ برابر اپنا کام کرتے رہیں گے اور جب ذرا بھی قوت پکڑ لیں گے تو اسے چھوڑنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے میں
 بھی دریغ نہ کریں گے۔ دوسرے فریق کی رائے یہ تھی کہ اسے اپنے ہاں سے نکال دو پھر جب یہ ہمارے درمیان نہ رہے تو ہمیں اس سے
 کچھ بھمت نہیں کہ کیا رہتا ہے اور کیا کرتا ہے، بہر حال اس کے وجود سے ہمارے نظام زندگی میں خلل پڑنا تو بند ہو جائے گا۔
 لیکن اسے بھی یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ یہ شخص جادو جیاں آدمی ہے، دلوں کو موہنے میں اسے جلا کمال حاصل ہے، اگر یہ یہاں سے نکل گیا
 تو نہ معلوم عرب کے کن کن قبیلوں کو اپنا پیر و بنائے گا اور پھر کتنی قوت حاصل کر کے قلب عرب کو اپنے اقتدار میں لانے کے لیے تم پر
 حملہ آور ہو گا۔ آخر کار ابو جہل نے یہ رائے پیش کی کہ ہم اپنے تمام قبیلوں میں سے ایک ایک عالی نسب تیز دست جوان منتخب
 کریں اور یہ سب مل کر ایک بارگہ محمد پر ٹوٹ پڑیں اور اسے قتل کر ڈالیں۔ اس طرح محمد کا خون تمام قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا اور بنو
 عبدمنان کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ سب سے روکیں اس لیے مجبوراً غوں بہا پر فیصلہ کرنے کے لیے راضی ہو جائیں گے۔ اس
 رائے کو سب نے پسند کیا، قتل کے لیے آدمی بھی نامود ہو گئے اور قتل کا وقت بھی مقرر کر دیا گیا، حتیٰ کہ جرات اس کام کے لیے تجویز کی گئی
 تھی اس میں ٹھیک وقت پر فاتحوں کا گروہ اپنی ڈیوٹی پہنچ بھی گیا، لیکن ان کا ہاتھ پٹنے سے پہلے ہی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آنکھوں
 میں خاک چھونک کر نکل گئے اور ان کی نبی بنائی تہذیب پر عین وقت پر ناکام ہو کر رہ گئی۔

أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۱﴾ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوْ ائْتِنَا بَعْدَآيِ الْيَوْمِ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

کہاں ہیں جو پہلے سے لوگ کتے چلے آ رہے ہیں۔ اور وہ بات بھی یاد ہے جو انہوں نے کہی تھی کہ ”خدا یا اگر یہ واقعی حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسادے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ“ اُس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جبکہ تو ان کے درمیان موجود تھا۔ اور نہ اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دیدے۔ لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے جبکہ وہ مسجد حرام کا راستہ روک رہے ہیں،

۲۶۔ یہ بات وہ دعا کے طور پر نہیں کہتے تھے بلکہ پہنچ کے انداز میں کہتے تھے۔ یعنی ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر واقعی یہ حق ہوتا اور خدا کی طرف سے ہوتا تو اس کے ٹھکانے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہم پر آسمان سے پتھر برستے اور عذاب الیم ہمارے اوپر ٹوٹ پڑتا۔ مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نہ حق ہے نہ میں جانب اللہ ہے۔

۲۷۔ ان کے اس سوال کا جواب ہے جو ان کی اوپر والی ظاہری دعائیں متضمن تھا۔ اس جواب میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کئی کدور میں کیوں عذاب نہیں بھیجا۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ جب تک کسی بستی میں موجود ہوا اور حق کی طرف دعوت دے رہا ہو اس وقت تک بستی کے لوگوں کو مہلت دی جاتی ہے اور عذاب بھیج کر قبل از وقت ان سے اصلاح پذیری کا موقع سلب نہیں کر لیا جاتا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب تک بستی میں سے ایسے لوگ بچے درپے نکلنے چلے آ رہے ہوں جو اپنی سابقہ غفلت اور غلط روی پر تائب ہو کر اللہ سے معافی کی درخواست کرتے ہوں اور آئندہ کے لیے اپنے رویہ کی اصلاح کر لیتے ہوں، اس وقت تک کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ اس بستی کو تباہ کر کے رکھ دے۔ البتہ عذاب کا اصلی وقت وہ ہوتا ہے جب نبی اس بستی پر رحمت پوری کرنے کے بعد بالہوس ہو کر وہاں سے نکل جائے یا نکال دیا جائے یا قتل کر ڈالا جائے، اور وہ بستی اپنے طرز عمل سے ثابت کر دے کہ وہ کسی صالح عنصر کو اپنے درمیان برداشت کرنے کے لیے

وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَ إِلَّا أَوْلِيَاءُكَ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَكِنَّ
 أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ
 إِلَّا مُكَاءً وَتَصَدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۳۴﴾
 إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِبُصْدُوٰءٍ عَن سَبِيلِ

حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولی تو صرف اہل تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں، مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ہیں پس اب لو، اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے اُس انکار حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے وہ اپنے مال خدا کے راستے سے

تیار نہیں ہے۔

۲۸ یہ اشارہ اس غلط فہمی کی تردید میں ہے جو لوگوں کے دلوں میں پھیلی ہوئی تھی اور جس سے عام طور پر اہل عرب دھوکا کھا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قریش چونکہ بیت اللہ کے مجاور اور متولی ہیں اور وہاں عبادت بجالاتے ہیں اس لیے ان پر اللہ کا فضل ہے۔ اس کے رویوں فرمایا کہ محض میراث میں مجاورت اور تولیت پالینے سے کوئی شخص یا گروہ کسی عبادت گزار کا جائز مجاور و متولی نہیں ہو سکتا۔ جائز مجاور و متولی تو صرف خدا ترس اور پرہیزگار لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ ایک جماعت کو جو خالص خدا کی عبادت کرنے والی ہے، اُس عبادت گاہ میں آنے سے روکتے ہیں جو خالص خدا کی عبادت ہی کے لیے وقف کی گئی تھی۔ اس طرح یہ متولی اور خادم بن کر رہنے کے بجائے اس عبادت گاہ کے مالک بن بیٹھے ہیں اور اپنے آپ کو اس بات کا مختار سمجھنے لگے ہیں کہ جس سے یہ ناراض ہیں اسے عبادت گاہ میں نہ آنے دیں۔ یہ حرکت ان کے ناخدا ترس اور ناپرہیزگار ہونے کی صریح دلیل ہے۔ رہی ان کی عبادت جو وہ بیت اللہ میں کرتے ہیں تو اس کے اندر نہ صرف شش و ششوع ہے، نہ تو جہاں اللہ ہے، نہ ذکر الہی ہے، بس ایک بے معنی شور و غل اور ہمو و لعب ہے جس کا نام انہوں نے عبادت رکھ چھوڑا ہے۔ ایسی نام نہاد خدمت بیت اللہ اور ایسی جھوٹی عبادت پر آخر یہ فضل الہی کے مستحق کیسے ہو گئے اور یہ چیز انہیں عذاب الہی سے کیونکر محفوظ رکھ سکتی ہے؟

۲۹ وہ سمجھتے تھے کہ عذاب الہی صرف آسمان سے پتھروں کی شکل میں یا کسی اور طرح توڑے فطرت کے ہتھیار ہی کی شکل میں آیا کرتا ہے۔ مگر یہاں انہیں بتایا گیا ہے کہ جنگ بدر میں اُن کی فیصلہ کن شکست، جس کی وجہ سے اسلام کے لیے زندگی

اللَّهُ فَسَيَنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۝
 وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿۳۸﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ
 الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضُهُ عَلَىٰ
 بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلُهُ فِي جَهَنَّمَ أُولَٰئِكَ هُمُ
 الْخٰسِرُونَ ﴿۳۹﴾ قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ
 مِمَّا قَدْ سَلَفَ وَإِنْ يَعُودُوا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتِ الْأَوَّلِينَ ﴿۴۰﴾
 وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ

روکنے کے لیے صرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے۔ مگر آخر کا یہی کوششیں
 ان کے لیے پھینتا دے گا سبب نہیں گی، پھر وہ مغلوب ہوں گے، پھر یہ کافر جہنم کی طرف گھیر لائے
 جائیں گے تاکہ اللہ گندگی کو پاکیزگی سے چھانٹ کر الگ کرے اور ہر قسم کی گندگی کو ملا کر اٹھا کرے
 پھر اس پلندے کو جہنم میں بھونک دے یہی لوگ اصل دیوالیے ہیں۔ ۳۸
 اسے نبیؐ، ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آجائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے
 درگزر کر لیا جائے گا، لیکن اگر یہ اسی گھپلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ
 ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

۳۹ لے ایمان لانے والوں، ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا

کا اور تدبیر نظام جاہلیت کے لیے موت کا فیصلہ ہوا ہے، دراصل ان کے حق میں اللہ کا عذاب ہی ہے۔

۴۰ اس سے بڑھ کر دیوالیہ پن اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان جس راہ میں اپنا تمام وقت، تمام محنت، تمام قابلیت،
 اور پورا سرمایہ زندگی کھپا دے اس کی انتہا پر پہنچ کر اسے معلوم ہو کہ وہ اسے سیدھی تباہی کی طرف سے آئی ہے اور اس راہ میں جو کچھ
 اس نے کھپایا ہے اس پر کوئی سود یا منافع پانے کے بجائے اسے اٹا جرمانہ بھگتنا پڑے گا۔

لِلّٰهِ فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۳۹﴾ وَإِنْ تَوَلَّوْا
فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿۴۰﴾
وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ
وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ

الجزء

اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ فتنہ سے رُک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے،
اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے۔
اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ
اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

۳۹۔ بیان پھر مسلمانوں کی جنگ کے اسی ایک مقصد کا اعادہ کیا گیا ہے جو اس سے پہلے سورہ بقرہ آیت ۱۹۳
میں بیان کیا گیا تھا۔ اس مقصد کا سبھی جزو یہ ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور ابجالی جزو یہ کہ دین بالکل اللہ کے لیے ہو جائے۔
اس ہی ایک اخلاقی مقصد یا سبب سے جس کے لیے لڑنا اہل ایمان کے لیے جائز بلکہ فرض ہے، اس کے سوا کسی دوسرے مقصد کی
لڑائی جائز نہیں ہے اور نہ اہل ایمان کو زبردیا ہے کہ اُس میں کسی طرح حصہ لیں۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ، حواشی
۲۰۷ و ۲۰۵)

۴۰۔ بیان اُس مال غنیمت کی تقسیم کا قانون دینا یا ہے جس کے متعلق تقریر کی ابتدا میں کہا گیا تھا کہ یہ اللہ کا انعام ہے
جس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول ہی کو حاصل ہے۔ اب وہ فیصلہ بیان کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ لڑائی
کے بعد تمام سپاہی ہر طرح کا مال غنیمت لاکر امیر یا امام کے سامنے رکھ دیں اور کوئی چیز چھپا کر نہ رکھیں۔ پھر اس مال میں سے پانچواں
حصہ ان اعراض کے لیے نکال لیا جائے جو آیت میں بیان ہوئی ہیں، اور باقی چار حصے ان سب لوگوں میں تقسیم کر دیے جائیں
جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا ہو۔ چنانچہ اس آیت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لڑائی کے بعد اعلان فرمایا کرتے تھے کہ
ان هذنا خمسکم وانه لیس فیہا الا نصیبی معکم الخمس والخمس مردود علیکم فادوا الخبیط
والمخیط واکبر من ذلک واصغر ولا تغلوا فان الغلول عأس و ناسر۔ یہ غنائم تمہارے ہی لیے ہیں، میری
اپنی ذات کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہے، بجز خمس کے اور وہ خمس بھی تمہارے ہی اجتماعی مصالح پر صرف کر دیا جاتا ہے۔
لہذا ایک ایک سوئی اور ایک ایک ناکا تک لاکر رکھ دو، کوئی چھوٹی یا بڑی چیز چھپا کر نہ رکھو کہ ایسا کرنا شرمناک ہے اور اس کا

إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ
يَوْمَ التَّفَقَّىٰ الْجَمْعَيْنِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۸۱﴾ إِذْ أَنْتُمْ
بِالْعُدُوَّةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدُوَّةِ الْقُصْوَىٰ وَالزَّكُّبِ أَسْفَلَ
مِنْكُمْ ۗ وَكُتِبَ عَلَيْكُمُ الْأَخْيَارُ ۚ لِيُقْضَىٰ
اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ لِيَهْلِكَ مَن هَلَكَ عَن بَيْتِنَا

اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز یعنی دونوں فوجوں کی مدد بھرنے کے دن، ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو)۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یاد کرو وہ وقت جبکہ تم وادی کے اس جانب تھے اور وہ دوسری جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف تھا۔ اگر کہیں پہلے سے تمہارے اور ان کے درمیان مقابلہ کی قرار دیا ہو چکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہنچتے کہ جاتے، لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس لیے تھا کہ جس بات کا فیصلہ اللہ کر چکا تھا اسے ظہور میں لے آئے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو

نتیجہ دوزخ ہے۔

اس تقسیم میں اللہ اور رسول کا حصہ ایک ہی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس کا ایک جزء اعلانِ حکمت اللہ اور اقامتِ دین حق کے کام میں صرف کیا جائے

رشتہ داروں سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو حضور ہی کے رشتہ دار تھے کیونکہ جب آپ اپنا سارا وقت دین کے کام میں صرف فرماتے تھے اور اپنی معاش کے لیے کوئی کام کرنا آپ کے لیے ممکن نہ رہا تھا تو لامحالہ اس کا انتظام ہونا چاہیے تھا کہ آپ کی اور آپ کے اہل و عیال اور ان دوسرے اقربا کی، جن کی کفالت آپ کے ذمہ تھی، ضروریات پوری ہوں۔ اس لیے جس میں آپ کے اقربا کا حصہ رکھا گیا۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ حضور کی وفات کے بعد ذوی القربی کا یہ حصہ کس کو پہنچانا ہے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ حصہ منسوخ ہو گیا۔ دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ حضور کے بعد یہ حصہ اس شخص کے اقربا کو پہنچے گا جو حضور کی جگہ خلافت کی خدمت انجام دے۔ تیسرے گروہ کے نزدیک یہ حصہ خاندانِ نبوت کے فقراء میں تقسیم کیا جانا ہے۔ چوتھے گروہ میں خلیفہ ہوں خلفاء راشدین کے زمانہ میں اسی تیسری رائے پر عمل ہوتا تھا۔

وَيَجِيءُ مَنْ حَىٰ عَنْ بَيْنَةٍ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۲﴾ إِذْ
 يُرِيكُمُ اللَّهُ فِي مَنَايِكَ قَلِيلًا وَلَوْ أَرَاكُمْ كَثِيرًا لَفِشَلْتُمْ
 وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ
 الصُّدُورِ ﴿۳۳﴾ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ التَّقَاتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا
 وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضَى اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۝

اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے، یقیناً خدا سننے اور جانتے والا ہے۔
 اور یاد کرو وہ وقت جبکہ اے نبی، خدا ان کو تمہارے خواب میں تھوڑا دکھارے گا۔ اگر کہیں
 وہ تمہیں ان کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملہ میں جھگڑ شروع
 کر دیتے، لیکن اللہ ہی نے اس سے تمہیں بچایا، یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔

اور یاد کرو جب کہ مقابلے کے وقت خدا نے تم لوگوں کی نگاہوں میں دشمنوں کو تھوڑا دکھایا
 اور ان کی نگاہوں میں تمہیں کم کر کے پیش کیا، تاکہ جو بات ہوئی تھی اُسے اللہ ظہور میں لے آئے،

۳۲ یعنی وہ تاہید و نصرت جس کی بدولت تمہیں فتح حاصل ہوئی۔

۳۳ یعنی ثابت ہو جائے کہ جو زندہ رہا اسے زندہ ہی رہنا چاہیے تھا اور جو ہلاک ہوا اسے ہلاک ہی ہونا چاہیے
 تھا۔ یہاں زندہ رہنے والے اور ہلاک ہونے والے سے مراد افراد نہیں ہیں بلکہ اسلام اور جاہلیت ہیں۔

۳۴ یعنی خدا اندھا، بہرا، بے خبر خدا نہیں ہے بلکہ دانا و بینا ہے۔ اس کی خدائی میں اندھا و صند کام
 نہیں ہو رہا ہے۔

۳۵ یہ اس وقت کی بات ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے کر مدینہ سے نکل رہے تھے یا راستہ میں کسی
 منزل پر تھے اور یہ متحقق نہ ہوا تھا کہ کفار کا لشکر فی الواقع کتنا ہے۔ اس وقت حضور نے خواب میں اس لشکر کو دیکھا اور ہر منظر
 آپ کے سامنے پیش کیا گیا اس سے آپ نے اندازہ لگایا کہ دشمنوں کی تعداد کچھ ہمت زیادہ نہیں ہے۔ یہی خواب آپ نے
 مسلمانوں کو سنا دیا اور اس سے ہمت پا کر مسلمان آگے بڑھتے چلے گئے۔

وَالِی اللّٰهِ تَرْجِعُ الْأُمُورَ ۚ یَاٰیہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِیْتُمْ
فِئۡتَہٗ فَاتَّبِعُوْا وَاذْكُرُوْا اللّٰہَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفۡحَمُوْنَ ۝۳۵ وَاَطِیَعُوا
اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفۡشَلُوْا وَتَذٰہَبَ رِجۡلُكُمْ وَاصْبِرُوْا
اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝۳۶ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ
دِیَارِہِمۡ بِطَرَفٍ وَّ سَرۡمَآءِ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنِ سَبِیْلِ اللّٰہِ

اور آخر کار سب سے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں ۳۵

اے ایمان لانے والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی جس سے کام لڑنا یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور ان لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اترتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

۳۵ یعنی اپنے جذبات و خواہشات کو قابو میں رکھو۔ جلد بازی، گھبراہٹ، ہراس، طغ اور نامناسب جوش سے بچو۔ ٹھنڈے دل اور سچی تکی قوت فیصلہ کے ساتھ کام کرو۔ خطرات اور مشکلات سامنے ہوں تو تمہارے قدموں میں لغزش نہ آئے۔ اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو غیظ و غضب کا پہچان تم سے کوئی بے عمل حرکت سرزد نہ کرانے پائے۔ معاصب کا حملہ ہو اور حالات بگڑتے نظر آ رہے ہوں تو اضطراب میں تمہارے حواس پر اگندہ نہ ہو جائیں۔ حصول مقصد کے شوق سے بے قرار ہو کر یا کسی نیم پختہ تدبیر کو سرسری نظر میں کارگر دیکھ کر تمہارے ارادے مشتاب کاری سے مغلوب نہ ہوں۔ اور اگر کبھی دنیوی فوائد و منافع اور لذات نفس کی ترغیبات تمہیں اپنی طرف مبصر ہی ہوں تو ان کے مقابلہ میں بھی تمہارا نفس اس درجہ کمزور نہ ہو کہ بے اختیار ان کی طرف کھینچ جاؤ۔ یہ تمام مغمومات صرف ایک لفظ ”صبر“ میں پوشیدہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ ان تمام بینیات سے صابر ہوں، میری تائید لانی کو حاصل ہے۔

۳۶ اشارہ ہے کفار قریش کی طرف، جن کا لشکر مکہ سے اس شان سے نکلا تھا کہ گانے بجانے والی لوتھریاں ساتھ تھیں، جگہ جگہ شیر کر قس و سردار در شراب نوشی کی محفلیں برپا کرتے جا رہے تھے، جو جو قبیلے اور قریبے راستے میں ملتے تھے

وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۸۴﴾ وَإِذْ زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ
أَعْمَاءَ لَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ
لَكُمْ فَلَمَّا تَرَأَتِ الْفِئْتَيْنِ نَكَصَ عَلَى عَقْبَيْهِ وَقَالَ

جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

ذرا خیال کرو اس وقت کا جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور یہ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گروہوں کا آمناسا منا ہوا تو وہ اٹھے پاؤں پھر گیب اور کہنے لگا کہ

ان پر اپنی طاقت و شوکت اور اپنی کثرت تعداد اور اپنے سرداروں کا رعب جماتے تھے اور ڈینگیں مارتے تھے کہ بھلا ہمارے مقابلہ میں کون سرفہا سکتا ہے۔ یہ تو مصلحتی ان کی اخلاقی حالت۔ اور اس پر مزید لعنت یہ مصلحتی کہ ان کے نکلنے کا مقصد ان کے اخلاق سے بھی زیادہ ناپاک تھا۔ وہ اس لیے جان و مال کی بازی لگانے نہیں نکلے تھے کہ حق اور راستی اور انصاف کا علم بند ہو، بلکہ اس لیے نکلے تھے کہ ایسا نہ ہونے پائے، اور وہ اکیلا گروہ بھی جو دنیا میں اس مقصد حق کے لیے اٹھا ہے ختم کر دیا جائے تاکہ اس حکم کو اٹھانے والا دنیا بھر میں کوئی نہ رہے۔ اس پر مسلمانوں کو تشبیہ کیا جا رہا ہے کہ تم کہیں ایسے نہ بن جانا۔ تمہیں اللہ نے ایمان اور حق پرستی کی جڑوں سے طاقی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمہارے اخلاق بھی پاکیزہ ہوں اور تمہارا مقصد جنگ بھی پاک ہو۔

یہ بلایت اسی زمانہ کے لیے تھی، آج کے لیے بھی ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ کفار کی فوجوں کا جو حال اس وقت تھا وہی آج بھی ہے۔ قبیح خانے اور فواحش کے اڈے اور شراب کے پیچھے ان کے ساتھ جنود لائیک کی طرح لگے رہتے ہیں خفیہ طور پر نہیں بلکہ علی الاعلان نہایت بے شرمی کے ساتھ وہ عورتوں اور شراب کا زیادہ سے زیادہ راشن مانگتے ہیں اور ان کے سپاہیوں کو خود اپنی قوم ہی سے یہ مطالبہ کرنے میں باک نہیں ہوتا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو مٹھی سے بڑی تعداد میں ان کی شہوات کا کھلو تاجنے کے لیے پیش کرے۔ پھر بھلا کوئی دوسری قوم ان سے کیا امید کر سکتی ہے کہ یہ اس کو اپنی اخلاقی گندگی کی سنڈاس بنانے میں کوئی کسر اٹھا رکھیں گے۔ رہا ان کا تکبر اور زنا خاں تو ان کے ہر سپاہی اور ہر افسر کی چال و حال اور انداز گفتگو میں وہ نمایاں دیکھا جاسکتا ہے اور ان میں سے ہر قوم کے مدیرین کی تقریروں میں لاعتقالب لکھرا ابوہ اور من اشتدنا قوت کا کی ڈینگیں مٹی جاسکتی ہیں۔ ان اخلاقی نجاستوں سے زیادہ ناپاک ان کے مقاصد جنگ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نہایت مکاری کے ساتھ دنیا کو بھین دلاتا ہے کہ اس کے پیش نظر انسانیت کی فلاح کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مگر درحقیقت ان کے پیش نظر ایک فلاح انسانیت ہی نہیں ہے، باقی سب کچھ ہے۔ ان کی لڑائی کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی زمین میں جو کچھ سارے انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے اس پر تنہا

إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ ۗ
 وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۳۸﴾ اِذْ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالَّذِينَ
 فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هَوَاهُمْ وَاذْبَاهُمْ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَىٰ
 اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۹﴾ وَكَو تَرَىٰ اِذْ يَتَوَقَّى الَّذِينَ
 كَفَرُوا الْمَلَائِكَةَ يَصْرِيحُونَ وَجُوهَهُمْ وَاذْبَاهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ
 الْحَرِيقِ ﴿۴۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ اَيْدِيكُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلّٰمٍ

میرا تمہارا ساتھ نہیں ہے، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے، مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے اور خدا بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔ جب کہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے، کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو تو ان کے دین نے جہنم میں مبتلا کر رکھا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔ کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جبکہ فرشتے مقتول کافروں کی رُو میں قبض کر رہے تھے۔ وہ ان کے چہروں اور ان کے کولھوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "لو اب جلنے کی سزا بھگتو، یہ وہ جزا ہے جس کا سامان تمہارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی عیا کر رکھا تھا، ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا

ان کی قوم منقرت ہو اور دوسرے اس کے چاکر اور دست نگرین کر رہیں۔ پس اہل ایمان کو قرآن کی یہ دائمی ہدایت ہے کہ ان فساق و فجار کے طور طریقوں سے بھی بچیں اور ان ناپاک نفاصد میں بھی اپنی جان و مال کھپانے سے پرہیز کریں جن کے لیے یہ لوگ لڑتے ہیں۔

۳۹ یعنی مدینہ کے منافقین اور وہ سب لوگ جو دنیا پرستی اور خُلا سے غفلت کے مرض میں گرفتار تھے، یہ دیکھ کر کہ مسلمانوں کی ٹمھی بھرے سرد سامان جماعت تشریح جیسی زبردست طاقت سے ٹکرانے کے لیے جا رہی ہے، آپس میں کہتے تھے کہ یہ لوگ اپنے دینی جوش میں دیوانے ہو گئے ہیں، اس معرکہ میں ان کی تباہی یقینی ہے، مگر اس نے کچھ ایسا فسوس ان پر بھیج دیا کہ ان کی عقل خبط ہو گئی ہے اور آنکھوں دیکھے یہ موت کے منتر میں چلے جا رہے ہیں۔

لِّلْعَيْدِ ۝۵۱ كَذَابِ آلِ فِرْعَوْنَ ۝ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَفَرُوا
 بِآيَاتِ اللَّهِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ
 الْعِقَابِ ۝۵۲ ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّبًا لِّعَمَلِكُمْ
 عَلَى قَوْمِهِ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ
 عَلِيمٌ ۝۵۳ كَذَابِ آلِ فِرْعَوْنَ ۝ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَبُوا
 بِآيَاتِ رَبِّهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ
 فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوا ظَالِمِينَ ۝۵۴ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ
 اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝۵۵ الَّذِينَ عَاهَدتَّ

نہیں ہے۔ یہ معاملہ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آیا جس طرح آل فرعون اور ان سے پہلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں بکڑیلا۔ اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ آل فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اسی ضابطہ کے مطابق تھا۔ انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تب ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ہلاک کیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔

یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والی مخلوق میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا پھر کسی طرح وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ ان خصوصاً ان میں سے وہ لوگ جن کے ساتھ

۵۵ یعنی جب تک کہ کوئی قوم اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی نعمت کا غیر مستحق نہیں سمجھتی اللہ اس سے اپنی نعمت

مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَ
هُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿۵۷﴾ فَمَا تَتَّقِفْتُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرَّادْبِهِمْ

تو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔
پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد جو دوسرے لوگ ایسی روش

سلب نہیں کیا کرتا۔

۱۵۲ یہاں خاص طور پر اشارہ ہے یہود کی طرف۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے انہی کے ساتھ حسن چل اور باہمی تعاون و مددگاری کا معاہدہ کیا تھا اور اپنی حد تک پوری کوشش کی تھی کہ ان سے خوشگوار تعلقات قائم رہیں۔ نیز دینی حیثیت سے بھی آپ یہود کو مشرکین کی بہ نسبت اپنے سے قریب تر سمجھتے تھے اور ہر معاملہ میں مشرکین کے بالمقابل اہل کتاب ہی کے طریقہ کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ان کے علماء اور شاخ کو توحیدِ خالص اور اخلاقِ صالحہ کی وہ تبلیغ اور عقائد کا دعویٰ گمراہیوں پر وہ تنقید اور اقامتِ دین حق کی وہ سعی، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے، ایک آن نہ جھاتی تھی اور ان کی بیہوش کوشش یہ تھی کہ یہ نئی تحریک کسی طرح کامیاب نہ ہوسکے۔ اسی مقصد کے لیے وہ مدینہ کے منافق مسلمانوں سے ساز باز کرتے تھے۔ اسی کے لیے وہ اوس اور خزرج کے لوگوں میں ان پرانی عداوتوں کو بھڑکاتے تھے جو اسلام سے پہلے ان کے درمیان کشت و خون کی موجب ہوا کرتی تھیں۔ اسی کے لیے قریش اور دوسرے مخالف اسلام قبیلوں سے ان کی تحفیہ سازشیں چل رہی تھیں اور یہ سب حرکات اُس معاہدہ دوستی کے باوجود ہو رہی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان لکھا جا چکا تھا۔ جب جنگ بدر واقع ہوئی تو ابتدا میں ان کو توقع تھی کہ قریش کی پہلی ہی چوٹ اس تحریک کا خاتمہ کر دے گی۔ لیکن جب نتیجہ ان کی توقعات کے خلاف نکلا تو ان کے سینوں کی آتش حسد اور زیادہ بھڑک اُٹھی۔ انہوں نے اس اندیشہ سے کہ بدر کی فتح کہیں اسلام کی طاقت کو ایک مستقل خطرہ نہ بنا دے اپنی مخالفانہ کوششوں کو تیز کر دیا۔ حتیٰ کہ ان کا ایک لیڈر کعب بن اشرف (جو قریش کی شکست سنے ہی پہنچ اٹھا تھا کہ آج زمین کا پیٹ ہمارے لیے اُس کی پیٹھ سے بہتر ہے) خود مل گیا اور وہاں اس نے ہجرتِ انگریز سرشتیہ کہہ کر قریش کو اتقام کا جوش دلایا۔ اس پر بھی ان لوگوں نے بس نہ کی۔ یہودیوں کے قبیلہ بنی قینقاع نے معاہدہ حسن جوار کے خلاف ان مسلمان عورتوں کو چھیڑنا شروع کیا جو ان کی بستی میں کسی کام سے جاتی تھیں۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس حرکت پر ملامت کی تو انہوں نے جواب میں دھمکی دی کہ یہ قریش بنا شدا، ہم لڑنے مرنے والے لوگ ہیں اور لڑنا جانتے ہیں۔ ہمارے مقابل میں آؤ گے تب تمہیں پتہ چلے گا کہ مر دیکھے ہوتے ہیں یا نہ۔

مَنْ خَلَفَهُمْ لَعَلَّهُمْ بَدَّكُرُونَ ﴿۵۷﴾ وَإِنَّمَا تَخَافَنَ مِنْ قَوْمٍ
خِيَانَةٌ كَانْتِدُ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ
الْمُخَافِينَ ﴿۵۸﴾ وَلَا يُحْسِبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۗ

اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔ توقع ہے کہ بدعمدوں کے اس انجام سے وہ سبق لیں گے۔ اور اگر کبھی نہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ منکرین حق اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے،

۵۷ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قوم سے ہمارا معاہدہ ہو اور پھر وہ اپنی معاہدہ ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر ہمارے خلاف کسی جنگ میں حصہ لے، تو ہم بھی معاہدے کی اخلاقی ذمہ داریوں سے شیک دوش ہو جائیں گے اور ہمیں حق ہو گا کہ اس سے جنگ کریں۔ نیز اگر کسی قوم سے ہماری لڑائی ہو رہی ہو اور ہم دیکھیں کہ دشمن کے ساتھ ایک ایسی قوم کے افراد بھی شریک جنگ ہیں جس سے ہمارا معاہدہ ہے، تو ہم ان کو قتل کرنے اور ان سے دشمن کا ساتھ کرنے میں ہرگز کوئی تامل نہ کریں گے، کیونکہ انہوں نے اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی قوم کے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق نہیں رہنے دیا ہے کہ ان کی جان و مال کے معاملوں میں اس معاہدے کا احترام ملحوظ رکھا جائے جو ہمارے اور ان کی قوم کے درمیان ہے۔

۵۸ اس آیت کی رو سے ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ یا ملک سے ہمارا معاہدہ ہو اور ہمیں اس کے طرز عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عہد شکنی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے یا یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا، تو ہم اپنی جگہ تو ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالیں گے اور اس کے درمیان معاہدہ نہیں رہنا اور یکایک اس کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کرنا شروع کر دیں جو معاہدہ نہ ہونے کی صورت میں ہی کیا جاسکتا ہو۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو ہم کوئی مخالفانہ کارروائی کرنے سے پہلے فریق ثانی کو صاف بتا دیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا، تاکہ فرسخ معاہدہ کا جیسا علم ہم کو حاصل ہے ویسا ہی اس کو بھی ہو جائے اور وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ معاہدہ اب بھی باقی ہے۔ اسی فرمان الہی کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول قرار دیا تھا کہ من کان بینہ و بین قومہ عہد فلا یحلل یخلفہ حتی ینقضی امدانہ او ینبذ الیہ عہد علی سوائہ۔ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہوا ہے چاہیے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا سبب نہ کھولے۔ یا نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔ پھر اسی قاعدے کو آپ نے اور زیادہ پھیل کر تمام معاملات میں عام اصول یہ قائم کیا تھا کہ لا تقن من خانک، جو ترجمہ سے خیانت کرے تو اس سے

خیانت نہ کر۔ اور یہ اصول صرف دُشمنوں میں بیان کرنے اور کتا بوں کی زینت بننے کے لیے نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کی پابندی کی جاتی تھی چنانچہ ایک مرتبہ جب امیر معاویہ نے اپنے عہد بادشاہی میں سرحد روم پر فوجوں کا اجتماع اس غرض سے کرنا شروع کیا کہ معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی بیکار روی علاقہ پر حملہ کر دیا جائے تو ان کی اس کارروائی پر عمر بن خطابؓ نے سخت احتجاج کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی حدیث سن کر کہا کہ معاہدہ کی مدت کے اندر یہ معاندانہ طرز عمل اختیار کرنا غلطی ہے۔ آخر کار امیر معاویہ کو اس اصول کے آگے سر جھکا دینا پڑا اور سرحد پر اجتماع فوج روک دیا گیا۔

ایک طرف فتنہ معاہدہ اور اعلان جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جاہلیت میں بھی تھا اور زمانہ حال کی مہذب جاہلیت میں بھی اس کا رواج موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں روس پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف روس و برطانیہ کی فوجی کارروائی میں دیکھی گئی ہیں۔ عموماً اس کارروائی کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملہ سے پہلے مطلع کر دینے سے دوسرا فریق ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرنا، یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو ہمارا دشمن فائدہ اٹھا لیتا لیکن اس قسم کے ہمانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کو سناٹا کر دینے کے لیے کافی ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی ہمانے نہ کیا جاسکتا ہو۔ ہر چور، ہر ڈاکو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعل ساز اپنے جرائم کے لیے ایسی ہی کوئی مصلحت بیان کر سکتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کے لیے اُن بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جب کہ ان کا ارتکاب قومی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلامی قانون صرف ایک صورت میں بلا اطلاع حملہ کرنے کو جائز رکھتا ہے، اور وہ صورت یہ ہے کہ فریق ثانی علی الاعلان معاہدہ کو توڑ چکا ہو اور اس نے صریح طور پر ہمارے خلاف معاندانہ کارروائی کی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہم اسے آیت مذکورہ بالا کے مطابق فتنہ معاہدہ کا ٹوٹس دیں بلکہ ہمیں اس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کارروائی کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ فقہانے اسلام نے یہ استثنائی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے نکالا ہے کہ قریش نے جب نبی خزاہ کے معاملہ میں صلح حدیبیہ کو علامہ لڑ دیا تو آپ نے پھر انہیں فتنہ معاہدہ کا ٹوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی، بلکہ بلا اطلاع مکہ پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اگر کسی موقع پر ہم اس قاعدہ استثناء سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو لازم ہے کہ وہ تمام حالات ہمارے پیش نظر رہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کارروائی کی تھی، تاکہ پیر روی ہو تو آپ کے پورے طرز عمل کی جو نہ کہ اس کے کسی ایک مفید مطلب جزو کی۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ:

اولاً، قریش کی خلاف ورزی عہد ایسی صورت تھی کہ اس کے نقض عہد ہونے میں کسی کلام کا موقع نہ تھا۔ خود قریش کے لوگ بھی اس کے معترف تھے کہ واقعی معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ انہوں نے خود اہل سفیان کو تجدید عہد کے لیے مدینہ بھیجا تھا جس کے صاف معذری تھے کہ ان کے نزدیک بھی عہد بانی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناقض عہد قوم کو خود بھی اپنے نقض عہد کا اعتراف ہو۔ البتہ یہ یقیناً ضروری ہے کہ نقض عہد بالکل صریح اور غیر مشتبہ ہو۔

ثانیاً، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحتاً یا اشارتاً و کتایتاً ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ایمان نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپ ابھی تک اُن کو ایک معاہدہ قوم سمجھتے ہیں اور ان کے

إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿۵۹﴾ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ
وَمِنْ سِرَابِطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ
الْآخِرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوا
مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿۶۰﴾

یقیناً وہ ہم کو ہرا نہیں سکتے۔

اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے
گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور
ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ
کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

ساتھ آپ کے معاہدہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابرو سفیان نے مدینہ آ کر تجدید معاہدہ کی درخواست
پیش کی تو آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔

توافقاً قریش کے خلاف جنگی کارروائی آپ نے خود کی اور کھلم کھلا کی۔ کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپ کے طرز عمل
میں نہیں پایا جاتا کہ آپ نے بظاہر صلح اور بیاطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال فرمایا ہو۔

یہ اس معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے، لہذا آیت مذکورہ بالا کے حکم عام سے ہٹ کر اگر کوئی کارروائی
کی جاسکتی ہے تو ایسے ہی مخصوص حالات میں کی جاسکتی ہے اور اسی سیدھے سیدھے شریفانہ طریقہ سے کی جاسکتی ہے جو حضور
نے اختیار فرمایا تھا۔

مزید برآں اگر کسی معاہدہ قوم سے کسی معاملہ میں ہماری نزاع ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ گفت و شنید یا بین الاقوامی ثالثی
کے ذریعہ سے وہ نزاع حل نہیں ہوتی، یا یہ کہ فریقِ ثانی اس کو زور طے کرنے پر تیار ہوا ہے، تو ہمارے لیے یہ بالکل جائز ہے کہ
ہم اس کو طے کرنے میں طاقت استعمال کریں، لیکن آیت مذکورہ بالا ہم پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ہمارا یہ استعمال
طاقت صاف صاف اعلان کے بعد ہونا چاہیے اور کھلم کھلا ہونا چاہیے۔ چوری چھپے ایسی جنگی کارروائیاں کرنا جن کا اعلان فرما کر
کرنے کے لیے ہم تیار نہ ہوں، ایک بد اخلاقی ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو نہیں دی ہے۔

لکن اس سے مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامانِ جنگ اور ایک مستقل فوج (Standing army) ہر وقت

وَأَنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ
هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۶۱﴾ وَإِنْ يَرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ
حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ﴿۶۲﴾
وَأَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا
مَا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ

اور اے نبی، اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو یقیناً وہی سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمنا ہے لیے اللہ کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مؤمنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مؤمنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے تم رُوئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے یقیناً وہ

تیار رہی چاہیے تاکہ برکتِ ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سر پر آنے کے بعد گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضا کار اور اہل علم اور مسلمان رسد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثنا میں کہ یہ تیاری مکمل ہو، دشمن اپنا کام کر جائے۔

۶۵ یعنی بین الاقوامی معاملات میں تمہاری پالیسی بزدلانہ نہیں ہونی چاہیے بلکہ خدا کے بھر دوسرے بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہیے۔ دشمن جب گفتگوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے بے تکلف اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھانے سے اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ صلح نہیں کرنا چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بہر حال قطعی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ واقعی صلح ہی کی نیت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شہدہ کر کے خوریزی کو طول کیوں دو۔ اور اگر وہ غداری کی نیت رکھتا ہو تو تمہیں خدا کے بھر دوسرے بہادر ہونا چاہیے۔ صلح کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھانا تاکہ تمہاری اخلاق بزرگی ثابت ہو اور دشمن کے لیے اٹھنے والے ہاتھ کو اپنی قوت بازو سے توڑ کر پھینک دو تاکہ کبھی کوئی غدار قوم تمہیں نرم چارہ سمجھنے کی جرأت نہ کرے۔

۶۶ اشارہ ہے اس جہاں چارے اور الفت و محبت کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے اہل عرب کے درمیان پیدا کر کے ان کو ایک مضبوط جھانڈا بنا دیا تھا، حالانکہ اس جھٹھے کے افراد ان مختلف قبیلوں سے نکلے ہوئے تھے جن کے درمیان

عَنْ يَزْحَكِيْمٍ ۙ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنْ اتَّبَعَكَ مِنَ
 الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِيْضُ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ
 اِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتِيْنَ وَاِنْ يَكُنْ
 مِنْكُمْ مِّاۤةٌ يَغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰۤاَتَّهُمْ قَوْمٌ
 لَا يَفْقَهُوْنَ ۙ اَللّٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ

بڑا زبردست اور دانا ہے۔ اے نبی! تمہارے لیے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لیے تو بس
 اللہ کافی ہے ۙ

اے نبی! مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دوسو پر
 غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے کیونکہ
 وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ اچھا، اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں

صدیوں سے دشمنیاں چلی آ رہی تھیں خصوصیت کے ساتھ اللہ کا فضل اوس و خزرج کے معاملہ میں تو سب سے زیادہ نمایاں تھا۔
 یہ دونوں قبیلے دو ہی سال پہلے تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور مشہور جنگ بعاث کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے
 تھے جس میں اوس نے خزرج کو اور خزرج نے اوس کو گویا صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایسی شدید عداوتوں کو دو
 تین سال کے اندر گہری دوستی و برادری میں تبدیل کر دینا اور ان متنافر اجزا کو جوڑ کر ایسی ایک بنیاد پر موقوف بنا دینا جیسی کہ نبی صلی اللہ
 علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلامی جماعت تھی، یقیناً انسان کی طاقت سے بالاتر تھا اور نبوی اسباب کی مدد سے یہ عظیم الشان کارنامہ
 انجام نہیں پاسکتا تھا پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہماری تاثیر و نصرت نے یہ کچھ کر دکھا یا ہے تو آئندہ بھی تمہاری نظر پوری
 اسباب پر نہیں بلکہ خدا کی تاثیر پر ہونی چاہیے کہ جو کچھ کام بنے گا اسی سے بنے گا۔

۷۷۷ آج کل کی اصطلاح میں جس چیز کو قوت منوی یا قوت اخلاق (Morale) کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اسی کو قدر
 قسم اور سمجھ بوجھ (Understanding) سے تعبیر کیا ہے، اور یہ لفظ اس مفہوم کے لیے جدید اصطلاح سے زیادہ مستطابک
 ہے۔ جو شخص اپنے مقصد کا صحیح شعور رکھتا ہو اور ٹھنڈے دل سے خوب سمجھ کر اس لیے لڑے یا ہو کہ جس چیز کے لیے وہ جان
 کی بازی لگانے آیا ہے وہ اس کی انفرادی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کے نتائج ہو جانے کے بعد جینا بے قیمت ہے،

ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَ
 إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ
 الصَّابِرِينَ ﴿۳۷﴾ مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى
 يُتَّخَذَ فِي الْأَرْضِ تَرْبِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يَرِيدُ

کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پورا ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر
 اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔
 کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں
 کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیش نظر

وہ بے شعوری کے ساتھ لڑنے والے آدمی سے کئی گنی زیادہ طاقت رکھتا ہے اگرچہ جسمانی طاقت میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ ہو۔
 پھر جس شخص کو حقیقت کا شعور حاصل ہو، جو اپنی ہستی اور خدا کی ہستی اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق اور حیات دنیا کی حقیقت اور
 موت کی حقیقت اور حیات بعد موت کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہو، اور جسے حقیقت اور باطل کے فرق اور غلبہ باطل کے نتائج کا بھی صحیح
 ادراک ہو، اس کی طاقت کو تو وہ لوگ بھی نہیں پہنچ سکتے جو قومیت یا وطنیت یا طبقاتی نزاع کا شعور لیے ہوئے میدان میں آئیں، یہی
 لیے فرمایا گیا ہے کہ ایک بھگ بوجھ رکھنے والے مؤمن اور ایک کافر کے درمیان حقیقت کے شعور اور عدم شعور کی وجہ سے نظریہ ایک اور دس
 کی نسبت ہے۔ لیکن یہ نسبت صرف بھگ بوجھ سے قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ صبر کی صفت بھی ایک لازمی شرط ہے۔

۳۷ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے ایک اور دس کی نسبت تھی اور اب چونکہ تم میں کمزوری آگئی ہے اس لیے ایک اور
 دو کی نسبت قائم کر دی گئی ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اصولی اور معیاری حیثیت سے تو اہل ایمان اور کفار کے درمیان
 ایک اور دس ہی کی نسبت ہے، لیکن چونکہ ابھی تم لوگوں کی اخلاقی تربیت مکمل نہیں ہوئی ہے اور ابھی تک تمہارا شعور اور تمہاری
 سمجھ بوجھ کا پیمانہ بلوغ کی حد کو نہیں پہنچا ہے اس لیے سر دست بر سبیل تنزیل تم سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے سے دو گنی طاقت سے
 ٹکرانے میں تو تمہیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ خیال رہے کہ یہ ارشاد سلسلہ جم کا ہے جب کہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ ابھی تازہ تازہ
 ہی داخل اسلام ہوئے تھے اور ان کی تربیت ابتدائی حالت میں تھی۔ بعد میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں یہ لوگ پختگی کو
 پہنچ گئے تو فی الواقع ان کے اور کفار کے درمیان ایک اور دس ہی کی نسبت قائم ہو گئی، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر حصار اور
 خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیوں میں بار بار اس کا تجربہ ہوا ہے۔

الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۶۷﴾ لَوْ لَا كَتَبَ مِنَ اللَّهِ سَبَقٌ
لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۶۸﴾ فَكُلُوا مِنَّمَا غَنِمْتُمْ
حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۶۹﴾

آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے
لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ
حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۷

۱۵۹ اس آیت کی تفسیر میں اہل تائیل نے جو روایات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں کہ جنگ بدر میں لشکر قریش کے جوڑگ گرفتار
ہوئے تھے ان کے متعلق بعد میں مشورہ ہوا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے حضرت ابو بکرؓ نے رائے دی کہ ذریعہ سے کچھ چھوڑ دیا
جائے اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ قتل کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کی رائے قبول کی اور ذریعہ کا معاملہ طے کر لیا۔
اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات بطور عتاب نازل فرمائیں۔ مگر مفسرین آیت کے اس فقرے کی کوئی معقول تائیل نہیں کر سکے ہیں کہ اگر
اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو وہ کتنے ہیں کہ اس سے مراد تقدیر الہی ہے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی ارادہ فرمایا تھا کہ
مسلمانوں کے لیے غنائم کو حلال کر دے گا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک وحی تشریحی کے ذریعہ سے کسی چیز کی اجازت نہ دی گئی ہو،
اس کا لینا جائز نہیں ہو سکتا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت پوری اسلامی جماعت اس تائیل کی رو سے گناہ گار قرار پاتی ہے اور
ایسی تائیل کو اختیار اعداد کے اعمدہ پر قبول کر لینا ایک بڑی ہی سخت بات ہے۔

میرے نزدیک اس مقام کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جنگ بدر سے پہلے سورہ محمد میں جنگ کے متعلق جو ابتدائی ہدایات دی گئی
تھیں ان میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ فَمَاذَا لَقِيْتُمْ مِنَ الدِّينِ كَفَرُوا فَضَرْبُ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْمَخْتُمْ ثُمَّ فُتِنْتُمْ
مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَإِن مَّا نَعَدُوا بِمَا فَعَدَا إِلَهُاتِهِمْ تَضَمُّعَ الْكُفْرِ أَوْ ذَاتَهُمْ ۚ آیت ۲۳ اس ارشاد میں جنگی قیدیوں سے
ذریعہ وصول کرنے کی اجازت تو دے دی گئی تھی لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی تھی کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کھل دیا جائے پھر
قیدی پکڑنے کی فکر کی جائے۔ اس فرمان کی رو سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کیے اور اس کے بعد ان سے جو ذریعہ وصول کیا
تھا تو اجازت کے مطابق، مگر غلطی یہ ہوئی کہ دشمن کی طاقت کو کھل دینے کی جو شرط مقدم رکھی گئی تھی اسے برادر کرنے میں کوتاہی کی گئی۔
جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ قیمت لٹھنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ کر باذہنہ میں لگ گیا
اور بہت کم آدمیوں نے دشمنوں کا کچھ دوزخ تعاقب کیا۔ حلال کہ اگر مسلمان پوری طاقت سے ان کا تعاقب کرتے تو قریش کی
طاقت کا اسی روز خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ عتاب فرما رہا ہے اور یہ عتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنَّ يَعْلَمَ
 اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرَ
 لَكُمْ وَاللَّهُ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۰﴾ وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ
 خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
 حَكِيمٌ ﴿۱۱﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ

اسے نبی، تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں
 میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اُس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری تخطائیں معاف
 کرے گا، اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے لیکن اگر وہ تیرے ساتھ خیانت کا ارادہ رکھتے
 ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں چنانچہ اسی کی سزا اللہ نے انہیں دی کہ وہ
 تیرے قابو میں آگئے، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم ہے۔

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لٹائیں اور اپنے

پرہے۔ فرمان مبارک کا منشا یہ ہے کہ تم لوگ ابھی نبی کے دشمن کو اچھی طرح نہیں سمجھے ہو۔ نبی کا اصل کام یہ نہیں ہے کہ فدیے اور
 غنائم وصول کر کے خزانے بھرنے بلکہ اس کے نصب العین سے جو چیز براہ راست تعلق رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ کفر کی طاقت
 ٹوٹ جائے۔ مگر تم لوگوں پر بار بار دنیا کا لالچ غالب ہو جاتا ہے۔ پہلے دشمن کی اصل طاقت کے بجائے قافلے پر حملہ کرنا چاہا، پھر
 دشمن کا سر کھینچنے کے بجائے غنیمت لوٹنے اور قیدی پرکڑنے میں لگ گئے، پھر غنیمت پر جھجکڑنے لگے۔ اگر ہم پہلے فدیہ وصول کرنے
 کی اجازت نہ دے چکے ہوتے تو اس پر نہیں سخت سزا دیتے۔ خیر اب جو کچھ تم نے لیا ہے وہ کھانا، گمراہ آئندہ ایسی روش سے بچتے
 رہو جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اس میں اس راستے پر پہنچ چکا تھا کہ امام غنیمت کی کتاب احکام القرآن میں یہ دیکھ کر مجھے مزید
 اطمینان حاصل ہوا کہ امام موصوف بھی اس تاویل کو کم از کم قابل لحاظ ضرور قرار دیتے ہیں۔ پھر سیرت ابن ہشام میں یہ روایت نظر
 سے گزری کہ جس وقت مجاہدین اسلام مال غنیمت لوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پرکڑ کر باندھنے میں لگے ہوتے تھے نبی صلی اللہ علیہ
 وسلم نے دیکھا کہ حضرت سعد بن معاذ کے چہرے پر کچھ کراہت کے آثار ہیں۔ حضور نے ان سے دریافت فرمایا کہ اے سعد، معلوم ہوتا
 ہے کہ لوگوں کی یہ کارروائی تمہیں پسند نہیں آ رہی ہے۔ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں یا رسول اللہ، یہ بھلا سہ کرے جس میں اللہ تعالیٰ

وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ
بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا
لَكُمْ مِّنْ وَلَا يَتَّبِعُهُم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا وَإِن

مال کپھائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک
دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آئیں گئے
تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ ہاں اگر وہ

نے اہل شرک کو شکست دلوائی ہے، اس موقع پر انہیں قیدی بنا کر ان کی جانیں بچا لینے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ان کو خوب کچل ڈالا جاتا
دجلد ۲- صفحہ ۲۸۸-۲۸۱

یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی ایک اہم دفعہ ہے۔ اس میں یہ اصول مقرر کیا گیا ہے کہ ولایت کا تعلق
صرف ان مسلمانوں کے درمیان ہو گا جو دارالاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر باہر سے آئیں تو ہجرت کر کے آجائیں۔ باقی رہے
وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کے حدود و ارضی سے باہر ہوں، تو ان کے ساتھ مذہبی اخوت تو ضرور قائم رہے گی، لیکن "ولایت" کا
تعلق نہ ہو گا، اور اسی طرح ان مسلمانوں سے بھی یہ تعلق ولایت نہ رہے گا جو ہجرت کر کے نہ آئیں بلکہ دارالکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت
سے دارالاسلام میں آئیں۔ ولایت کا لفظ عربی زبان میں حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قربت، سرپرستی
اور اس سے ملنے جلتے معنومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور اس آیت کے سیاق و سباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ
ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے، اور شہریوں کا اپنی ریاست سے، اور خود شہریوں کا آپس میں ہوتا ہے۔ پس یہ آیت
مدد ستوری و سیاسی ولایت کو اسلامی ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے، اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص
رشتہ سے خاسخ قرار دیتی ہے۔ اس عدم ولایت کے قانونی نتائج ہمت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع
نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صرف اننا اشارہ کافی ہو گا کہ اسی عدم ولایت کی بنا پر دارالکفر و دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے
کے وارث نہیں ہو سکتے، ایک دوسرے کے قانونی ولی (Guardian) نہیں بن سکتے، باہم شادی بیاہ نہیں کر سکتے،
اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے ہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دارالکفر سے شہریت کا تعلق نہ
توڑا ہو۔ علاوہ بریں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی رو سے دولت اسلامیہ کی ذمہ داری
ان مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر رہتے ہیں۔ باہر کے مسلمانوں کے لیے کسی ذمہ داری کا بار اس کے سر
نہیں ہے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمائی ہے کہ انابری من کل مسلمین ظہرائی

اَسْتَنْصِرُكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمْ النَّصْرُ اِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ
وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۴۲﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا

دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔ جو لوگ منکر حق ہیں

الغنائم کیجئے۔ میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت و حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔ اس طرح اسلامی قانون نے اس جھگڑے کی جڑ کاٹ دی ہے جو بالعموم بین الاقوامی پیچیدگیوں کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی حکومت اپنے حدود سے باہر رہنے والی بعض نقلیتوں کا ذمہ اپنے سر لے لیتی ہے تو اس کی وجہ سے ایسی الجھنیں پڑ جاتی ہیں جن کو بار بار کی لڑائیاں بھی نہیں سمجھا سکتیں۔

۱۵۰ اور یہی آیت میں دارالاسلام سے باہر رہنے والے مسلمانوں کو "سیاسی ولایت" کے رشتہ سے خارج قرار دیا گیا تھا۔ اب یہ آیت اس امر کی توضیح کرتی ہے کہ اس رشتہ سے خارج ہونے کے باوجود وہ "دینی اخوت" کے رشتہ سے خارج نہیں ہیں۔ اگر کہیں ان پر ظلم ہو رہا ہو اور وہ اسلامی برادری کے تعلق کی بنا پر دارالاسلام کی حکومت اور اس کے باشندوں سے مدد مانگیں تو ان کا فرض ہے کہ اپنے ان مظلوم بھائیوں کی مدد کریں۔ لیکن اس کے بعد مزید توضیح کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ان دینی بھائیوں کی مدد کا فریضہ اندھا دھند انجام نہیں دیا جائے گا بلکہ بین الاقوامی ذمہ داریوں اور اخلاقی حدود کا پاس دلچسپی رکھتے ہوئے ہی انجام دیا جائے گا۔ اگر ظلم کرنے والی قوم سے دارالاسلام کے معاہدہ تعلقات ہوں تو اس صورت میں مظلوم مسلمانوں کی کوئی ایسی مدد نہیں کی جاسکے گی جو ان تعلقات کی اخلاقی ذمہ داریوں کے خلاف پڑتی ہو۔

آیت میں معاہدہ کے لیے "ہیثائق" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ "وثوق" ہے جو عربی زبان کی طرح اردو زبان میں بھی بھروسے اور اعتماد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میثاق ہر اس چیز کو کہیں گے جس کی بنا پر کوئی قوم بطریق معروت یہ اعتماد کرنے میں حق بجانب ہو کہ ہمارے اور اس کے درمیان جگہ نہیں ہے، قطع نظر اس سے کہ ہمارا اس کے ساتھ مزاج طور پر عدیم شمار یہ کا عہد و پیمانہ ہو یا نہ ہو۔

پھر آیت میں دیکھ کر دیدتھو ہیثائق کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، یعنی "تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو" اس سے یہ صاف متضح ہوتا ہے کہ دارالاسلام کی حکومت نے جو معاہدہ تعلقات کسی غیر مسلم حکومت سے قائم کیے ہوں وہ صرف دو حکومتوں کے تعلقات ہی نہیں ہیں بلکہ دو قوموں کے تعلقات بھی ہیں اور ان کی اخلاقی ذمہ داریوں میں مسلمان حکومت کے ساتھ مسلمان قوم اور اس کے افراد بھی شریک ہیں۔ اسلامی شریعت اس بات کو قطعاً جائز نہیں رکھتی کہ مسلم حکومت جو معاملات کسی ملک یا قوم سے طے کرے ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے مسلمان قوم یا اس کے افراد سبک دوش رہیں۔ البتہ حکومت

بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي
 الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿۴۲﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا
 وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَا وَنَصَرُوا أُولَئِكَ
 هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۴۳﴾
 وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ
 فَأُولَئِكَ مِنْكُمْ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ
 فِي كِتَابِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۴۴﴾



وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد
 برپا ہوگا۔

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے
 پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے
 اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے
 وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔ مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ مفدار
 ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

دارالاسلام کے معاملات کی پابندیاں صرف ان مسلمانوں پر ہی عائد ہوں گی جو اس حکومت کے دائرہ عمل میں رہتے ہوں اس
 دائرے سے باہر دنیا کے باقی مسلمان کسی طرح بھی ان ذمہ داریوں میں شریک نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیبیہ میں جو صلح
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ سے کی تھی اس کی بنا پر کوئی پابندی حضرت ابو بکر اور ابو جہل اور ان دوسرے مسلمانوں پر
 عائد نہیں ہوئی جو دارالاسلام کی رعایا نہ تھے۔

۵۲ اس فقرے کا تعلق اگر قریب ترین فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح کفار ایک دوسرے کی حمایت

کہتے ہیں اگر تم اہل ایمان اسی طرح آجیس میں ایک دوسرے کی حمایت نہ کرو تو زمین میں فتنہ اور فساد عظیم برپا ہوگا۔ اور اگر اس کا تعلق ان تمام بیویات سے مانا جائے جو آیت ۲۷ سے یہاں تک دی گئی ہیں تو اس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے ولی نہ بنیں، اور اگر ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہ آئے والے اور دارالکفر میں مقیم رہنے والے مسلمانوں کو اہل دارالاسلام اپنی سیاسی ولایت سے خارج نہ سمجھیں، اور اگر باہر کے مظلوم مسلمانوں کے مدد مانگتے ہیں ان کی مدد نہ کی جائے، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ اس قاعدے کی پابندی بھی نہ کی جائے کہ جس قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو اس کے خلاف مدد مانگنے والے مسلمانوں کی مدد نہ کی جائے گی، اور اگر مسلمان کافروں سے مولانا کا تعلق ختم نہ کریں، تو زمین میں فتنہ اور فساد عظیم برپا ہوگا۔

۳۵ مراد یہ ہے کہ اسلامی بھائی چارے کی بنا پر میراث قائم نہ ہوگی اور نہ وہ حقوق جو نسب اور مصاہرت کے تعلق کی بنا پر عائد ہوتے ہیں، وہی بھائیوں کو ایک دوسرے کے معاملہ میں حاصل ہوں گے۔ ان امور میں اسلامی تعلق کے بجائے رشتہ داری کا تعلق ہی قانونی حقوق کی بنیاد رہے گا۔ یہ ارشاد اس بنا پر فرمایا گیا ہے کہ ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخاۃ کرائی تھی اس کی وجہ سے بعض لوگ یہ خیال کر رہے تھے کہ یہ دینی بھائی ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے۔

Tafheem-ul-Quran [The Meaning of the Quran] - S Abul A'la Maududi

▼ Surah!